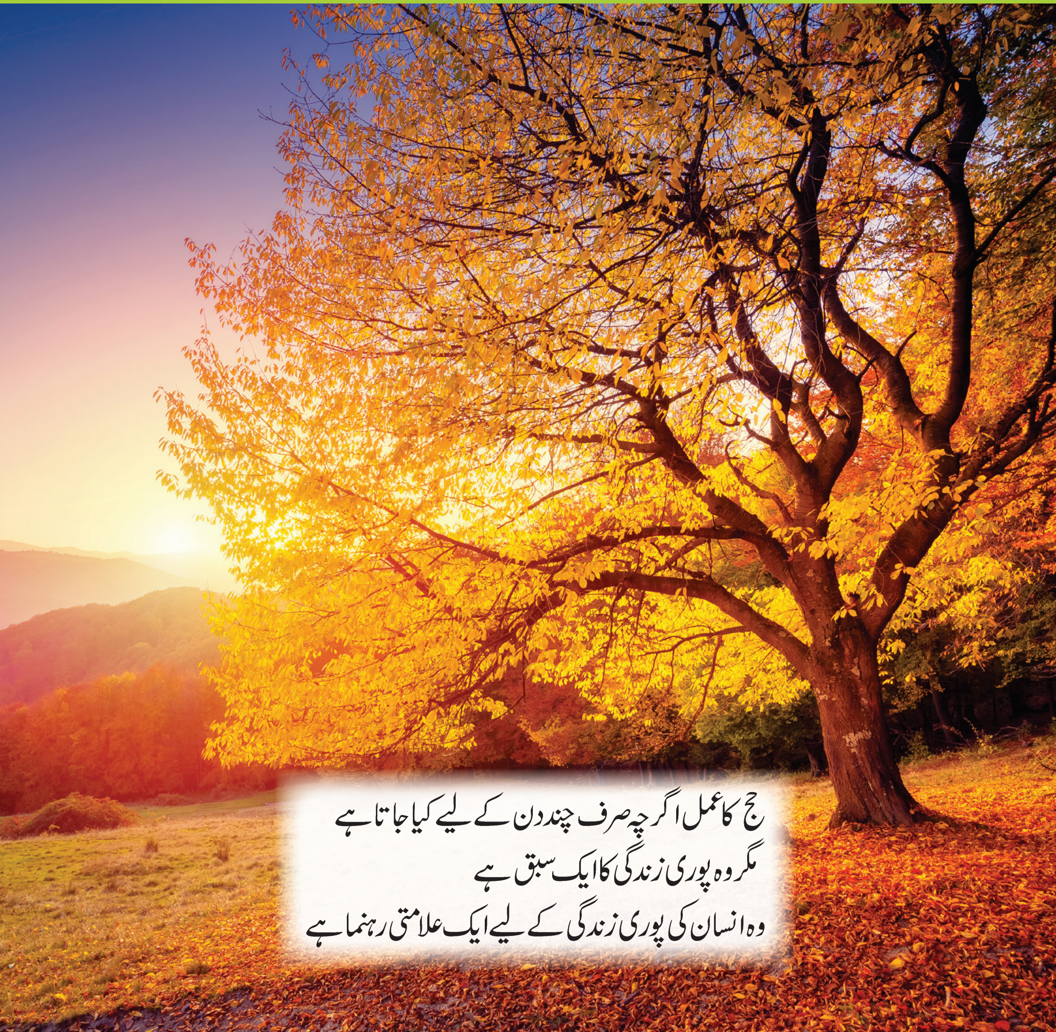
الرسالہ
Al-Risala

August 2019 ● Rs. 30



بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

الرسالہ

جاری کردہ 1976

زیر سرپرستی

مولانا وحید الدین خاں

صدر اسلامی مرکز

فہرست

حج کا مقصد	4
دعا کیسے کریں	5
الخیر فیما وقع	8
قرآن، کتاب مہجور	9
دعوت کے کام میں استقامت	10
اسلامی دعوت	12
اسلام دورِ جدید میں	21
فراہی اسکول کا کنٹری بیوشن	24
عظیم قربانی	26
دعوہ ایکسپلوزن	28
دنیا انتظار میں ہے	30
امن کا مقصد	32
سیلف گلوری	33
اسلامی نظام	34
میل ملاپ کا سماج	39
ایک سنگین برائی	40
بڑھاپے کا دور	41
پختگی کیا ہے	43
صحیح طرزِ فکر	44
ہار کے بعد جیت	45
خواتین کو مشغولیت دیجیے	46
جاپانی قوم کی ترقی کا راز	47
خبر نامہ اسلامی مرکز	48

Vol. No. 43 | Issue No. 08 | 2019 اگست

Retail Price	Rs 30/- per copy
Subs. by Book Post	Rs 300/- per year
Subs. by Reg. Post	Rs 400/- per year
International Subs.	USD 20 per year

Electronic Money Order (eMO)
Al Risala Monthly
1, Nizamuddin (W), Market
New Delhi-110 013

Bank Details: Al-Risala Monthly
Punjab National Bank
A/C No. 0160002100010384
IFSC Code: PUNB0016000.
Nizamuddin West Market
New Delhi - 110013

Customer Care Al-Risala
Call/Whatsapp/SMS: **+91-8588822679**
Ph. No. **+91 11 41827083**
cs.alrisala@gmail.com

Paytm Accepted Here
Mobile: 8588822679

Goodword Customer Care
+91-8588822672
sales@goodwordbooks.com

Printed and Published by Saniyasnain Khan on behalf of Al-Markazul Islami, New Delhi
Printed at Tara Art Printers Pvt. Ltd., A46-47, Sector 5, Noida-201301, UP.
Published from 1, Nizamuddin West Market, New Delhi-110013. Editor: Saniyasnain Khan
Total Pages: 52

حج کا مقصد

حج کے سلسلے میں قرآن میں جو آیتیں آئی ہیں، اس کا ایک حصہ یہ ہے: لِيَشْهَدُوا مَنَافِعَ لَهُمْ (22:28)۔ یعنی تا کہ وہ اپنے فائدے کے لیے حاضر ہوں۔ قرآن کی اس آیت میں حج کی نسبت سے منافع کا ذکر آیا ہے۔ منافع کا لفظی مطلب ہے فائدہ (benefit)۔ منافع منفعت کی جمع ہے، یعنی کئی قسم کے فائدے۔ قرآن کی اس آیت میں بظاہر کسی متعین فائدے کا ذکر نہیں ہے۔ اس سے یہ اخذ ہوتا ہے کہ منافع کا تعلق غور وفکر سے ہے، نہ کہ کسی متعین حوالے سے۔ اگر حاجی اس معاملے میں ایک تیار ذہن (prepared mind) بنا ہوا ہو، اور اس تیار ذہن کو لے کر وہ حج کا سفر کرے تو حج کے مقامات کو دیکھ کر اس کا ذہن ٹریگر ہوگا، اور وہ اپنے لیے منافع کا پہلو دریافت کرے گا۔

میں نے 1982 میں ایک عرب شیخ سلیمان القائد کے ساتھ حج کا سفر کیا تھا۔ وہاں میرا وقت مراسم حج کے علاوہ صرف کعبہ کے پاس رہنے میں گزرتا تھا۔ میں کعبہ کو دیکھ کر اس کے بارے میں مسلسل غور کرتا تھا۔ اس غور وفکر کے دوران ایک بات میرے ذہن میں یہ آئی کہ قرآن کی آیت میں منافع کا لفظ ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حج کے سفر میں مختلف قسم کے منافع موجود ہیں۔ آدمی اپنے غور وفکر کے دوران ان منافع کو دریافت کرسکتا ہے۔ مثلاً میں نے جب کعبہ کو دیکھا تو میں نے پایا کہ ابراہیمی کعبہ کی تعمیر ریکٹینگل شیپ کے مطابق تھی۔ لیکن بعد کو قدیم عمارت کے ٹوٹنے کے بعد کعبہ کی جو عمارت بنائی گئی، وہ ایک چوکور عمارت ہے۔ قدیم تعمیر کے لحاظ سے تقریباً ایک تہائی جگہ خالی چھوٹی ہوئی ہے، جس کو حطیم کہا جاتا ہے۔ اس سے میرے ذہن نے یہ مطلب نکالا کہ اگر کوئی قدیم عمارت ٹوٹ جائے، اور اس کی جگہ نئی عمارت بنانا ہو تو بہتر ہے کہ اس کو باقی ماندہ رقبے پر بنایا جائے۔ مثلاً امت مسلمہ پہلے ایک بڑی ایمپائر کی صورت میں تھی۔ اب وہ ایمپائر ٹوٹ چکی ہے۔ ایسی حالت میں اگر امت مسلمہ کی تشکیل نو کی جائے تو وہ باقی ماندہ حصہ پر کی جائے گی۔ یہ صحیح نہ ہوگا کہ قدیم ایمپائر کو دوبارہ کھڑا کرنے کی کوشش سے اس کی تعمیرِ نو کا آغاز کیا جائے۔

دعا کیسے کریں

’’میرے لیے ایک سائیکل خرید دیجیے‘‘ بیٹے نے باپ سے کہا۔ باپ کی آمدنی کم تھی۔ وہ سائیکل خریدنے کی پوزیشن میں نہ تھا۔ اس نے ٹال دیا۔ لڑکا بار بار کہتا رہا اور باپ بار بار منع کرتا رہا۔ بالآخر ایک روز باپ نے ڈانٹ کر کہا ’’میں نے کہہ دیا کہ میں سائیکل نہیں خریدوں گا۔ اب آئندہ مجھ سے اس قسم کی بات مت کرنا‘‘۔

یہ سن کر لڑکے کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ وہ کچھ دیر چپ رہا۔ اس کے بعد روتے ہوئے بولا : ’’آپ ہی تو ہمارے باپ ہیں۔ پھر آپ سے نہ کہیں تو اور کس سے کہیں‘‘۔ اس جملہ نے باپ کو تڑپا دیا۔ اچانک اس کا انداز بدل گیا۔ اس نے کہا: اچھا بیٹے اطمینان رکھو میں تمھارے لیے سائیکل خریدوں گا۔ اور کل ہی خریدوں گا‘‘۔ یہ کہتے ہوئے باپ کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ اگلے دن اس نے پیسہ کا انتظام کرکے بیٹے کے لیے نئی سائیکل خرید دی۔

لڑکے نے بظاہر ایک لفظ کہا تھا۔ مگر یہ ایک ایسا لفظ تھا جس کی قیمت اس کی اپنی زندگی تھی، جس میں اس کی پوری ہستی شامل ہوگئی تھی۔ اس لفظ کا مطلب یہ تھا کہ اس نے اپنے آپ کو اپنے سرپرست کے آگے بالکل خالی کردیا ہے۔ یہ لفظ بول کر اس نے اپنے آپ کو ایسے نقطہ پر کھڑا کردیا جہاں اس کی درخواست اس کے سرپرست کے لیے بھی اتنا ہی بڑا مسئلہ بن گئی جتنا خود اس کے لیے۔

اس واقعہ سے سمجھا جاسکتا ہے کہ ذکرِ الٰہی کی وہ کون سی قسم ہے جو میزان کو بھر دیتی ہے اور جس کے بعد خدا کی رحمتیں بندے کے اوپر امنڈ آتی ہیں۔ یہ رٹے ہوئے الفاظ کی تکرار نہیں ہے۔ نہ اس کا کوئی ’’نصاب‘‘ ہے۔ یہ ذکر کی وہ قسم ہے جس میں بندہ اپنی پوری ہستی کو انڈیل دیتا ہے۔ جب بندہ اپنے آپ کو اپنے رب کے ساتھ اتنا زیادہ شامل کردیتا ہے کہ ’’بیٹا‘‘ اور ’’باپ‘‘ دونوں ایک ترازو پر آجاتے ہیں — یہ وہ لمحہ ہے جب کہ ذکر محض لغت کا لفظ نہیں ہوتا بلکہ ایک شخصیت کے پھٹنے کی آواز ہوتا ہے۔ اس وقت خدا کی رحمتیں اپنے بندے پر ٹوٹ پڑتی ہیں۔ بندگی اور خدائی دونوں ایک

دوسرے سے راضی ہوجاتے ہیں— قادر مطلق عاجز مطلق کو اپنی آغوش میں لے لیتا ہے۔

مادی حالات، روحانی دعائیں

حضرت موسی علیہ السلام پر قتل کا الزام عائد ہو گیا، اور مصری سرداروں نے مشورہ کیا کہ انھیں ہلاک کردیں، تو پیغمبر موسیٰ مصر سے مدین چلے گئے۔ مدین اس زمانہ میں، خلیج عقبہ کے مشرقی اور مغربی کناروں پر واقع علاقہ کو کہا جاتا تھا، جہاں بنی مدیان آباد تھے۔ یہ مقام فرعونِ مصر کی سلطنت سے باہر تھا۔ اس لیے حضرت موسی نے مصر سے نکل کر مدین کا رخ کیا۔

قرآن میں ہے کہ جب آپ خوف اور اندیشہ کی حالت میں سفر کر رہے تھے تو اللہ کو یاد کرتے ہوئے آپ کی زبان سے یہ کلمہ نکلا: عَسَى رَبِّي أَنْ يَهْدِيَنِي سَوَاءَ السَّبِيلِ (28:22)۔ یعنی امید ہے کہ میرا رب مجھے ٹھیک راستہ کی طرف رہنمائی کرے گا۔

بعض مفسرین قرآن نے اس کو محض راستہ کی تلاش کے معنی میں لیا ہے۔ ایک مفسر اس کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

”یعنی ایسے راستہ پر جس سے میں بخیریت مدین پہنچ جاؤں“۔

یہ الفاظ اس کیفیت کی ترجمانی کے لیے بہت ناقص ہیں، جو حضرت موسی کے دل میں پیدا ہوئی تھی، یہ ایک مومنانہ کلمہ ہے نہ کہ عام معنوں میں محض ایک راستہ کے مسافر کی دعا۔ حضرت موسی کو اگرچہ مادی حالات نے مصر سے نکال کر مدین کے راستہ پر ڈالا تھا، مگر بندۂ مومن کا یہ حال ہوتا ہے کہ مادی واقعات کے اندر بھی اس کی زبان سے روحانی دعائیں نکلتی ہیں۔ بظاہر وہ اس زمین میں راستہ تلاش کر رہا ہوتا ہے، مگر زمین میں راستہ کی تلاش اس کے لیے دوسری دنیا کی یاددہانی بن جاتی ہے، مگر اس کے اندر کا طوفان پکار رہا ہوتا ہے— ”خدایا! مجھے وہاں پہنچا دے جہاں میں تجھ کو پا سکوں۔ کیوں کہ انسان کی حقیقی منزل وہی ہے“۔

حضرت موسیٰؑ کا یہ کلمہ ایک نازک ایمانی کیفیت کا کلمہ ہے۔ اس کو سفر اور جغرافیہ کے الفاظ میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔

جولوگ حقیقی معنوں میں اپنے رب کو پالیں، ان کے جینے کی سطح بالکل دوسری ہوجاتی ہے۔ وہ موجودہ دنیا میں رہتے ہوئے بھی آخرت کی فضاؤں میں پہنچ جاتے ہیں۔ وہ آج کی لذتوں اور تلخیوں کو دیکھتے ہوئے کل کی جنت اور جہنم کو یاد کرنے لگتے ہیں۔ مومن حقیقت میں وہی ہے جو دنیا میں آخرت کے عالم کو دیکھ لے۔ جو حالتِ غیب میں رہتے ہوئے حالتِ شہود میں پہنچ جائے۔ غیر مومن پر بھی وہ دن آئے گا جب کہ وہ آخرت کی دنیا کو اپنی آنکھوں سے دیکھے گا۔ مگر یہ اس وقت ہوگا جب کہ غیب وشہود کا فرق مٹ چکا ہوگا۔ جب قیامت کی چنگھاڑ سارے پردوں کو پھاڑ دے گی۔ مگر اس وقت کا دیکھنا کسی کے کچھ کام نہ آئے گا۔ کیونکہ وہ بدلہ پانے کا وقت ہوگا نہ کہ ایمان ویقین کا ثبوت دینے کا وقت۔

رزقِ روحانی کا دسترخوان

ساری کائنات مومن کے لیے رزق روحانی کا دسترخوان ہے۔ موجودہ دنیا کی تمام چیزوں کو اس طرح بنایا گیا ہے کہ ان کو دیکھ کر انسان عبرت حاصل کرے، ان کے ذریعہ وہ ان ربانی کیفیات کو پالے جو ان کے اندر ان لوگوں کے لیے رکھ دی گئی ہیں جو اللہ سے ڈرنے والے ہوں۔ ڈھاک (flame of the forest) ایک معمولی درخت ہے۔ مگر اس کے اوپر بے حد حسین پھول اُگتے ہیں۔ موسم خزاں کے پت جھڑ کے بعد اس کا درخت بظاہر ایک سوکھی لکڑی کی مانند، اس سے بھی زیادہ ایک سوکھی زمین پر کھڑا ہوتا ہے۔ اس کے بعد ایک خاموش انقلاب آتا ہے۔ حیرت انگیز طور پر نہایت خوش رنگ پھول اس کی شاخوں میں کھل اٹھتے ہیں۔ سوکھی لکڑی کا ایک ڈھانچہ لطیف اور رنگین پھولوں سے ڈھک جاتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے گویا ایک محروم اور بے قیمت وجود کے لیے خدا نے خصوصی طور پر اپنی خوب صورت چھتری بھیج دی ہے۔

ایسا اس لیے ہوتا ہے کہ کوئی بندۂ خدا اس کو دیکھ کر کہے — ''خدایا! میں بھی ایک ڈھاک ہوں، تو چاہے تو میرے اوپر حسین پھول کھلا دے۔ میں ایک ٹھنٹھ ہوں، تو چاہے تو مجھ کو سرسبز وشاداب کردے۔ میں ایک بے معنی وجود ہوں، تو چاہے تو میری زندگی کو معنویت سے بھر دے۔ میں جہنم کے کنارے کھڑا ہوں تو چاہے تو مجھ کو جنت میں داخل کردے۔

الخیر فیما وقع

ایک مشہور عربی قول ان الفاظ میں آیا ہے: الخیر فیما وقع۔ یعنی جو ہوا، وہی بہتر ہے:

What happens, happens for the good.

یہ قول غالباً امید خیر کے معنی میں ہے۔ یعنی معاملے کا سرا سب کا سب اللہ رب العالمین کے ہاتھ میں ہے۔ اس لیے یہ امید رکھو کہ جو ہوا، اس میں خداوند رحمٰن ورحیم نے ہمارے لیے کوئی خیر رکھا ہوگا۔ اس طرح یہ قول گویا دعا کے معنی میں ہے۔ ایک حدیث قدسی میں آیا ہے: إِنَّ رَحْمَتِي غَلَبَتْ غَضَبِي (صحیح البخاری، حدیث نمبر 3194)۔ یعنی میری رحمت میرے غضب پر غالب ہے۔ جب بندوں کے بارے میں اللہ رب العالمین کا یہ فیصلہ ہے تو بندے کو ہر حال میں اپنے رب سے خیر کی امید کرنا چاہیے۔

لیکن یہ ضروری نہیں ہے کہ اللہ کے فیصلۂ رحمت کا نتیجہ فوراً سامنے آجائے۔ نتیجے میں تاخیر ہوسکتی ہے، لیکن اصولی اعتبار سے اللہ کا فیصلہ بہر حال بندے کے لیے رحمت پر مبنی فیصلہ ہوگا۔ بندہ اپنی سوچ کے لحاظ سے رحمت کا طالب ہوتا ہے، لیکن اللہ کا فیصلہ رحمت کے عمومی مصلحت کے مطابق ظاہر ہوتا ہے۔ اس لیے عین ممکن ہے کہ بندہ جلدی کا طالب ہو، لیکن اللہ کا فیصلہ بندے تک تاخیر کے ساتھ پہنچے۔ ایسی حالت میں بندہ کو چاہیے کہ وہ ہر حال میں امید پر قائم رہے۔ وہ ہر حال میں یقین رکھے کہ اللہ رب العالمین اس کے ساتھ رحمت کا معاملہ فرمائے گا، خواہ اس فیصلے کا ظہور تاخیر کے ساتھ ہو، یا جلد ہی اس کا ظہور سامنے آجائے۔

بندہ اپنی خواہش کے مطابق طالب بن جاتا ہے، لیکن اللہ کا فیصلہ اپنے مقرر منصوبہ کے مطابق ظاہر ہوتا ہے۔ اللہ کو زیادہ بہتر طور پر معلوم ہے کہ بندہ کے لیے خیر کس چیز میں ہے۔ اللہ کا فیصلہ خود اپنے فیصلے کے مطابق ظاہر ہوتا ہے، نہ کہ بندے کی خواہش کے مطابق۔ بندہ کو یقین رکھنا چاہیے کہ اس کے حق میں اللہ کا جو فیصلہ بھی ہو، بہر حال وہ اس کے لیے خیر پر مبنی ہوگا۔

قرآن، کتاب مہجور

قرآن کی سورہ الفرقان میں ایک آیت ان الفاظ میں آئی ہے: وَقَالَ الرَّسُولُ يَارَبِّ إِنَّ قَوْمِي اتَّخَذُوا هَذَا الْقُرْآنَ مَهْجُورًا (25:30)۔ یعنی رسول کہے گا کہ اے میرے رب، میری قوم نے اس قرآن کو بالکل چھوڑ دیا تھا۔

اس آیت سے اولاً وہ لوگ مراد ہیں جن کے سامنے قرآن آتا ہے، مگر وہ اس پر ایمان نہیں لاتے۔ جیسا کہ مکی دور میں قریش نے کیا۔ تاہم اس نفسیات کا عملی مظاہرہ کبھی ان لوگوں کی طرف سے بھی ہوتا ہے جو بظاہر قرآن کو ماننے والوں کی فہرست میں داخل ہوں۔ مولانا شبیر احمد عثمانی اپنی تفسیر قرآن میں آیت کے ذیل میں لکھتے ہیں :

> ’’آیت میں اگرچہ مذکور صرف کافروں کا ہے۔ تاہم قرآن کی تصدیق نہ کرنا، اس میں تدبر نہ کرنا، اس کی تلاوت نہ کرنا، اس کی تصحیح قرأت کی طرف توجہ نہ کرنا، اس سے اعراض کرکے دوسری لغویات یا حقیر چیزوں کی طرف متوجہ ہونا، یہ سب صورتیں درجہ بدرجہ ہجرانِ قرآن کے تحت داخل ہوسکتی ہیں‘‘۔

قرآن کے ماننے والوں کے لیے قرآن کو ’’کتاب مہجور‘‘ بنانے کی یہ شکل کبھی نہیں ہوتی کہ اس کا احترام وتقدس لوگوں کے دلوں میں باقی نہ رہے۔ برکت اور تقدس کا نشان ہونے کی حیثیت سے وہ ہمیشہ اس کو اپنے طاق کی زینت بنائے رہتے ہیں۔ البتہ وہ اس سے فکری رہنمائی لینا چھوڑ دیتے ہیں۔ خدا کی کتاب میں ان کے لیے ذہنی غذا نہیں ہوتی۔ وہ ان کی حقیقی زندگی کا سرمایہ نہیں بنتی۔ وہ ان کی دنیا پرستانہ زندگی کے لیے ’’برکت کا تعویذ‘‘ تو ضرور ہوتی ہے مگر آخرت کی رہنما کتاب کی حیثیت سے ان کی زندگی میں اس کا کوئی مقام نہیں ہوتا— یہ مطلب ہے خدا کی کتاب کو ’’کتاب مہجور‘‘ بنا دینے کا۔

دعوت کے کام میں استقامت

قرآن میں پیغمبرِ اسلام کو خطاب کرتے ہوئے ایک آیت ان الفاظ میں آئی ہے: فَاصْبِرْ كَمَا صَبَرَ أُولُو الْعَزْمِ مِنَ الرُّسُلِ وَلَا تَسْتَعْجِلْ لَهُمْ كَأَنَّهُمْ يَوْمَ يَرَوْنَ مَا يُوعَدُونَ لَمْ يَلْبَثُوا إِلَّا سَاعَةً مِنْ نَهَارٍ بَلَاغٌ فَهَلْ يُهْلَكُ إِلَّا الْقَوْمُ الْفَاسِقُونَ (46:35)۔ یعنی پس تم صبر کرو جس طرح ہمت والے پیغمبروں نے صبر کیا۔ اور ان کے لیے جلدی نہ کرو جس دن یہ لوگ اس چیز کو دیکھیں گے جس کا ان سے وعدہ کیا جارہا ہے تو گویا کہ وہ دن کی ایک گھڑی سے زیادہ نہیں رہے۔ یہ پہنچا دینا ہے۔ پس وہی لوگ برباد ہوں گے جو نافرمانی کرنے والے ہیں۔

دعوت الی اللہ کا کام ایک بے حد نازک کام ہے۔ اس کام میں داعی کو ہر قدم پر استقامت (perseverance) کا ثبوت دینا پڑتا ہے۔ استقامت سے مراد یہ نہیں ہے کہ داعی اور مدعو کے درمیان لڑائی ہو، اور آپ اس میں جم کر مقابلہ کریں۔ بلکہ اس کا مطلب ہے صبر و برداشت کی استقامت۔ دعوت الی اللہ کا کام پورا کا پورا صبر و برداشت کا امتحان ہے— مدعو کی بے رخی کو برداشت کرنا، مدعو کی کڑوی باتوں کو برداشت کرنا، مدعو کی گالیوں کے جواب میں ان کے لیے دعائیں کرنا، وغیرہ۔

دعوت الی اللہ کا کام یک طرفہ صبر کا کام ہے۔ دعوتی اخلاق یہ ہے کہ مدعو آپ سے بدسلوکی کرے، اور آپ اس کے ساتھ اچھے اخلاق پر قائم رہیں۔ داعی کے اخلاق کو ایک حدیث میں ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے: أَمَرَني ربي أن أَصِلَ مَنْ قَطَعَني، وأعطي مَنْ حَرَمَني، وأَعْفُوَ عَمَّنْ ظَلَمَني (جامع الاصول، حدیث نمبر 9317)۔ یعنی اللہ نے مجھے حکم دیا ہے کہ میں اس سے جڑوں، جو مجھے کاٹے، اور میں اس کو عطا کروں، جو مجھے محروم کرے، اور اس کو معاف کردوں، جس نے مجھ پر ظلم کیا۔

دعوت الی اللہ کا کام ایک ایسا کام ہے، جس میں مدعو کے مقابلے میں داعی کا کوئی حق نہیں

ہوتا، اس کی صرف ذمے داریاں ہی ذمے داریاں ہوتی ہیں۔ مثلاً پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کا مشن یہ تھا کہ بت پرستی کے کلچر کو دنیا سے ختم کیا جائے، لیکن آپ نے پہلے لمبی مدت تک اس بت پرستی کے کلچر کو برداشت کیا، حتی کہ آپ نے اس کو بھی برداشت کیا کہ لوگ مقدس کعبہ کو عملاً بت پرستی کا مرکز بنا دیں۔ آپ نے کعبہ میں بت پرستی کو برداشت کرتے ہوئے، اس کو آپ بطور موقع استعمال کریں۔ چنانچہ آپ نے کعبہ میں بت پرستی کے اجتماع کو اپنے لیے لمبی مدت تک بطور آڈینس (audience) استعمال کیا۔ کعبہ میں آپ نے بت پرستی کی سرگرمیوں کو دیکھا، اور اس پر کبھی احتجاج یا ٹکراؤ نہیں کیا، وغیرہ۔

موجودہ زمانے میں دعوتی تیاری کا پہلا کام یہ ہے کہ اہلِ ایمان اس حقیقت کو دریافت کریں کہ ان کی حیثیت داعی کی ہے، اور دوسری اقوام کی حیثیت مدعو کی۔ موجودہ زمانے کے مسلمان ماضی کے اثر کے تحت اس حقیقت سے بے خبر ہو گئے ہیں۔ وہ اپنے آپ کو ایک قوم اور دوسرے لوگوں کو دوسری قوم سمجھتے ہیں۔ یہ دوقومی نظریہ ہے، اور دوقومی نظریہ ایک سراسر غیر اسلامی تصور ہے۔ یہ ایک مبنی بر جہالت تصور ہے۔ قرآن و حدیث میں اس کی کوئی اصل موجود نہیں۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم ایک انقلابی پیغمبر تھے۔ مگر یہ انقلاب ایک پراسس کے روپ میں لمبی تاریخ کے دوران ظہور میں آیا، نہ کہ کسی اچانک اعلان کے ذریعے۔ یعنی پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم بلاشبہ ایک عالمی پیغمبر تھے۔ لیکن اس کا ظہور یکبارگی نہیں ہوا، بلکہ تاریخی پراسس کی صورت میں لمبی مدت کے دوران ہوا۔ اس تاریخی پراسس میں صرف امتِ محمدی شامل نہیں تھی، بلکہ دوسری اقوام نے بھی اس تاریخی پراسس میں حصہ لیا۔ اس نکتے کو سمجھنا بہت ضروری ہے۔

اکیسویں صدی میں امتِ محمدی کو اپنا فائنل رول ادا کرنا ہے۔ یہ فائنل رول ان کے لیے فرض عین کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ فائنل رول وہی ہے جس کو قرآن میں اعلیٰ سطح پر تبیینِ حق (فصلت، 41:53) کہا گیا ہے، اور حدیث میں غالباً اسی دعوتی عمل کو شہادتِ اعظم (صحیح مسلم، حدیث نمبر 2938) کا درجہ دیا گیا ہے۔

اسلامی دعوت

The Need for Re-orientation in Islamic Da‘wah

پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کا مشن دعوت الی اللہ (اسلامی دعوت) تھا۔ آپ نے یہ کام 610ء میں مکہ میں شروع کیا۔ اُس وقت آپ اِس مشن میں تنہا تھے، پھر دھیرے دھیرے لوگ اسلام قبول کرتے رہے۔ اورآپ کے ساتھیوں کی تعداد بڑھتی رہی۔ ابتدائی تیرہ سال تک اسلامی دعوت کا کام اسی طرح چلتا رہا۔ اُس وقت سارا فوکس اسلام کی بیسک آئڈیالوجی پر تھا، یعنی توحید اور آخرت۔

اُس وقت مکہ میں مشرکین کا غلبہ تھا۔ مکی دور کے آخر میں وہاں کے مشرک سرداروں نے محسوس کیا کہ اسلام کی تحریک اُن کے لیے خطرہ بن رہی ہے۔ اب انھوں نے سختی کا طریقہ اختیار کیا۔ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھیوں پر تشدد کرنے لگے، یہاں تک کہ انھوں نے یہ فیصلہ کیا کہ وہ پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کو قتل کرڈالیں۔ اِس مقصد کے لیے وہ ضروری تیاریاں کرنے لگے۔ اُس وقت، پیغمبر اسلام کے ساتھیوں میں جوابی مقابلے کا ذہن پیدا ہوا۔ انھوں نے چاہا کہ اپنی طاقت کو مجتمع کرکے وہ مشرکین سے لڑیں۔ اُس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ کہہ کر لوگوں کو خاموش کردیا کہ تم لوگ صبر کرو، کیوں کہ مجھے لڑنے کا حکم نہیں دیا گیا ہے (اصبروا فإنی لم أومر بالقتال) المواہب اللدنیۃ بالمنح المحمدیۃ جلد 1، صفحہ 199۔

اگر آپ کار پر ایک جگہ سے دوسری جگہ جانے کے لیے سفر کریں تو درمیان میں بار بار دوسرے مقامات کو جانے والے راستے آتے ہیں۔ آپ اِن راستوں کی طرف نہیں جاتے، بلکہ اپنی گاڑی کو سیدھے رخ پر چلاتے رہتے ہیں، یہاں تک کہ آپ منزل پر پہنچ جاتے ہیں۔ یہی معاملہ اسلامی تحریک کا ہے۔ اسلامی تحریک کا اصل نشانہ دعوت الی اللہ ہے، مگر تحریک جب عملاً جاری ہوتی ہے تو سفر کے دوران بار بار موڑ کے مقامات آتے ہیں۔ ایسے مواقع پر ضروری ہوتا ہے کہ تحریک کو کسی اور طرف مڑنے سے بچایا جائے، اور اُس کا سفر دعوت الی اللہ کی منزل کی

طرف جاری رکھا جائے۔

مکی دور کے آخر میں اِس قسم کی ایک صورت حال پیش آئی۔ اُس وقت اگر ایسا ہوتا کہ اہلِ ایمان کی جماعت، مشرکین کی جماعت کے ساتھ متشددانہ ٹکراؤ شروع کردے تو اِس کا مطلب یہ تھا کہ اسلامی تحریک، دعوت الی اللہ کی صراطِ مستقیم سے ہٹ کر قتال کی جانب مُڑ گئی۔ ایسا ہونے کا مطلب یہ تھا کہ مشرک سردار اپنے مقصد میں کامیاب ہوگئے۔

یہ وقت، دعوت کی سمتِ سفر کی دوبارہ تصحیح (re-orientation) کا تھا۔ اُس وقت پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ سے ہجرت کا فیصلہ کیا۔ ہجرت کیا تھی، وہ فرار (flight) یا پسپائی نہ تھی، ہجرت دراصل ایک تدبیر تھی، جس کے ذریعے پیغمبر اسلام نے اسلامی دعوت کو متشددانہ ٹکراؤ کی طرف مڑنے سے بچایا۔ اِس تدبیر سے آپ کو یہ موقع مل گیا کہ دعوت الی اللہ کا جو کام آپ مکہ میں کررہے تھے، اس کو آپ مدینہ میں جاری رکھیں۔ ہجرت اپنی حقیقت کے اعتبار سے مقامِ عمل کی تبدیلی تھی، نہ کہ سادہ طور پر ترکِ وطن۔ اِس تدبیر کا غیر معمولی فائدہ ہوا۔ چنانچہ اسلام تیزی سے مدینہ اور اطرافِ مدینہ میں پھیلنے لگا۔

مگر مکہ کے مشرک سرداروں کو یہ بات پسند نہ آئی۔ انھوں نے اسلامی تحریک کو بزور ختم کرنے کا فیصلہ کیا۔ یہ مشرک سردار اُس وقت عرب میں سیاسی لیڈر کی حیثیت رکھتے تھے۔ اُن کو ہر قسم کے ذرائع حاصل تھے۔ ان کو وہ طاقت بھی حاصل تھی، جس کو موجودہ زمانے میں ٹرانس بارڈر ملٹری کیپیبلٹی (trans-border military capability) کہا جاتا ہے، یعنی سرحد کو پار کرکے حملہ کرنے کی صلاحیت۔

اب مکہ کے مشرک سرداروں نے یہ فیصلہ کیا کہ وہ اپنی فوج تیار کریں اور اقدام کرکے مدینہ پر باقاعدہ حملہ شروع کردیں۔ اِس معاملہ کا پہلا بڑا واقعہ وہ تھا، جس کو غزوۂ بدر (2 ہجری) کہا جاتا ہے۔ اس کے بعد غزوۂ اُحُد (3 ہجری) کا واقعہ پیش آیا۔ اِس طرح جھڑپوں کی صورت میں کئی متشددانہ واقعات پیش آئے۔

مشرکین مکہ کے جنگی ارادوں نے دوبارہ اسلامی تحریک کے لیے خطرہ پیدا کردیا کہ وہ دعوت الی اللہ کے راستے سے ہٹ کر قتال کے راستے کی طرف مڑ جائیں۔ اُس وقت دوبارہ اُس تدبیر کو اختیار کرنے کی ضرورت تھی، جس کو ہم نے ری اورین ٹیشن (re-orientation) کہا ہے۔ اب پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے مخصوص تدبیر کے ذریعے مشرکین سے ختمِ جنگ کا وہ معاہدہ فرمایا، جس کو معاہدۂ حدیبیہ (Hudaybiyah Agreement) کہا جاتا ہے۔ یہ معاہدہ 6 ہجری میں طویل گفت وشنید کے بعد کیا گیا۔ اِس معاہدے میں پیغمبر اسلام نے مشرک سرداروں کی تمام شرطوں کو یک طرفہ طور پر مان لیا، صرف اِس لیے کہ آپ اُنھیں راضی کریں کہ وہ جنگ کا راستہ چھوڑ کر قیامِ امن کے طریقے کو اختیار کرلیں۔ اِس معاہدے کا یہ تاریخ ساز فائدہ ہوا کہ اسلامی تحریک جنگی انحراف سے ہٹ کر دعوت الی اللہ کے راستے پر آ گئی۔ اِس کے بعد رسول اور اصحابِ رسول کو یہ موقع ملا کہ وہ نہ صرف عرب میں، بلکہ بیرونِ عرب تک اسلامی دعوت کے کام کو منظم طور پر پھیلا سکیں۔

حدیبیہ ایگری مینٹ کی اِسی غیر معمولی اہمیت کی بنا پر اُس کو فتح مبین (الفتح، 48:1) کہا گیا ہے، یعنی کھلی ہوئی فتح۔ یہاں یہ بات قابلِ غور ہے کہ حدیبیہ ایگری مینٹ فریقِ مخالف کی شرطوں پر کیا گیا تھا۔ حتی کہ اس کے بارے میں صحابہ کی اکثریت کا یہ خیال تھا کہ یہ معاہدہ پسپائی کا معاہدہ ہے۔ اِس کے باوجود کیوں قرآن نے اس کو فتح مبین قرار دیا۔

قرآن کا یہ اعلان دراصل فطرت کے اس قانون کا بیان ہے کہ اس دنیا میں ٹکراؤ کے مقام پر پیچھے ہٹنے والے آگے بڑھتے ہیں۔ یہاں شکست پر راضی ہونے والے کو کامیابی حاصل ہوتی ہے۔ فطرت کے قانون کے مطابق، اِس دنیا میں ہار کا نتیجہ جیت کی صورت میں نکلتا ہے:

Success is the outcome of defeat.

بدقسمتی سے بعد کی صدیوں میں مسلمان اِس پیغمبرانہ حکمت کو بھول گئے۔ حدیبیہ اسپرٹ سے لوگ اتنا زیادہ غافل ہوگئے کہ بعد کی پوری تاریخ میں کوئی بھی شخص نظر نہیں آتا، جو اِس عظیم حکمت کو سمجھے اور دوبارہ مسلمانوں کے اندر حدیبیہ اسپرٹ کو زندہ کرنے کی کوشش کرے۔ مزید بدقسمتی یہ

ہے کہ موجودہ زمانے میں بھی بے خبری کا یہ سلسلہ جاری ہے۔ آج ایسے لوگ تو بہت ملیں گے جو حدیبیہ کی بات کو پسپائی قرار دیں گے، لیکن ایسے لوگ تقریباً معدوم ہیں، جو حدیبیہ کے اندر چھپے ہوئے دعوتی امکانات کو سمجھ سکیں۔ خلافتِ راشدہ کے بعد اسلام، سیاسی عظمت کے دور میں داخل ہوگیا۔ اب اسلام نے ایمپائر کی صورت اختیار کرلی — اُموی ایمپائر، عباسی ایمپائر، فاطمی ایمپائر، اندلسی ایمپائر، مغل ایمپائر، عثمانی ایمپائر، وغیرہ۔ یہ دور تاریخی اعتبار سے عظمت کا دور تھا، لیکن دعوت الی اللہ کے اعتبار سے وہ انحراف (diversion) کا دور بن گیا۔

اب مسلمانوں میں دعوتی ذہن کے بجائے سیاسی ذہن عام ہوگیا۔ اسی سیاسی ذہن کے تحت یہ کہا جانے لگا کہ مسلمان زمین میں خدا کے خلیفہ (vicegerent of God) ہیں۔ ہمارا کام یہ ہے کہ ہم ساری دنیا میں اسلام کی حکومت قائم کریں۔ اِسی سوچ کے زیرِ اثر یہ نظریہ پیدا ہوا کہ مسلم ممالک 'دارالاسلام' ہیں اور غیر مسلم ممالک 'دارالحرب' یا 'دارالکفر' کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اِس نظریے کا یہ منفی نتیجہ نکلا کہ مسلمان دوسری قوموں کو مدعو کے بجائے حریف اور رقیب کے روپ میں دیکھنے لگے۔ مسلمان عمومی طور پر دعوت الی اللہ کے طریقے سے ہٹ کر سیاسی اقتدار کے منحرف راستے پر چلنے لگے۔

اِن بعد کی صدیوں میں اگرچہ عمومی سطح پر مسلمانوں کا ذہن یہی تھا، لیکن جُزئی طور پر مسلمانوں کے اندر ایسے گروہ اٹھتے رہے، جو غیر سیاسی میدان میں اسلام کو آگے بڑھاتے رہے۔ مثال کے طور پر محدثین نے سیاسی سرگرمیوں کو چھوڑ کر اپنے آپ کو حدیثِ رسول کی خدمت میں لگایا۔ صوفیا نے حکمرانوں سے دوری اختیار کرکے روحانی ارتقا کا کام کیا، جس کا فائدہ دعوت الی اللہ کے اعتبار سے بھی ظاہر ہوا۔ اِسی طرح ایسے علما پیدا ہوتے رہے جنھوں نے سیاسی جہاد سے الگ رہ کر مسجد اور مدرسے جیسے ادارے سنبھال لیے، اور اُن کے ذریعے بالواسطہ طور پر دعوت کی اسپرٹ زندہ رکھی۔

اِسی قسم کی غیر سیاسی شخصیتوں کا ایک بڑا کارنامہ وہ ہے، جو تیرھویں صدی عیسوی میں پیش آیا۔ تاتاری قبائل بعض وجوہ سے مسلمانوں کے مخالف بن گئے۔ انھوں نے ایک بڑا لشکر تیار کرکے عباسی سلطنت پر حملہ کردیا۔ انھوں نے سمرقند سے لے کر بغداد اور حلب تک، مسلم علاقے کو

زبردست نقصان پہنچایا۔ انھوں نے ہلاکوخان کے زیرقیادت 1258ء میں عباسی سلطنت کا خاتمہ کردیا۔لیکن اس کے بعد یہ ہوا کہ ان تاتاری فاتحین نے اسلام قبول کرلیا۔ یہ واقعہ اتنا حیرت انگیز تھا کہ مورخین نے اس کا مندرجہ ذیل قسم کے الفاظ میں اعتراف کیا:

The conquerors have accepted the religion of the conquered. (T.W. Arnold, *The Preaching of Islam,* London, 1913, p. 2)

The religion of the Muslims had conquered, where their arms had failed. (P.K. Hitti, *History of the Arabs,* London, 1989, p. 488)

انیسویں صدی عیسوی میں اسلام کی تاریخ ایک نئے دور میں داخل ہوتی ہے۔اب ایسا ہوا کہ مغربی قومیں جدید سائنس اور جدید ٹکنالوجی سے مسلح ہوکر مسلم علاقوں میں داخل ہوگئیں۔انھوں نے ایشیا اور افریقہ کے مسلم ملکوں پر براہِ راست یا بالواسطہ قبضہ کرلیا۔ اِس دور کو نوآبادیاتی دور (colonial period) کہا جاتا ہے۔ اِس دور میں دعوت الی اللہ کے نقطۂ نظر سے سب سے بڑا انحراف پیدا ہوا۔ اب تمام دنیا کے مسلمان منفی ردّعمل کا شکار ہوگئے۔ ہر جگہ ایسے مسلم لیڈر اٹھے، جو مغربی قوموں کو اسلام کا دشمن بتا کر ان کے خلاف فکری یا عملی لڑائی لڑنے لگے۔

نوآبادیاتی دور ایک اعتبار سے گلوبل انٹریکشن (global interaction) کا دور تھا۔جدید کمیونی کیشن کی بنا پر ایسا ہوا کہ ساری دنیا میں لوگوں کی آمد ورفت بڑے پیمانے پر ہونے لگی۔ اِس دوران قدرتی طور پر ایسا ہوا کہ مغربی قوموں کا انٹرایکشن مسلمانوں سے ہونے لگا۔ ایک نیا عملی شعبۂ استشراق (orientalism) پیدا ہوا جس کے تحت، مغربی علماء بڑے پیمانے پر اسلامی مضامین کا مطالعہ کرنے لگے۔

اسلام ایک فطری مذہب ہے، وہ انسان کی فطرت کو اپیل کرتا ہے، وہ ہر متلاشئ حق (seeker) کے لیے، اُس کی اپنی تلاش کا جواب ہے۔ اِس بنا پر ایسا ہوا کہ اسلام خود اپنے زور پر لوگوں کے دلوں اور دماغوں میں داخل ہونے لگا۔مغرب کے سنجیدہ افراد اپنے آپ اسلام قبول کرنے لگے۔مثلاً برطانیہ میں لارڈ ہیڈلے فاروق، ہنگری میں ڈاکٹر عبد الکریم جُرمانوس، آسٹریا میں ڈاکٹر لیوپولڈ اسد،

وغیرہ۔ تاہم یہ دعوتی عمل (da'wah process) زیادہ بڑے پیمانے پر جاری نہ ہوسکا۔ کیوں کہ زیادہ بڑے پیمانے پر دعوتی عمل جاری ہونے کے لیے ضرورت ہے کہ مسلمان براہِ راست دعوتی سرگرمیاں انجام دیں۔ مگر ابلیس نے اپنی تزئین کے ذریعے مسلمانوں کو غیر دعوتی کاموں کی طرف متوجہ کردیا۔ اِس بنا پر دعوتی عمل مسلمانوں کی مین اسٹریم (mainstream) میں داخل نہ ہوسکا۔

ابلیس یا شیطان یہ کام کس طرح کرتا ہے، اس کا جواب قرآن سے معلوم ہوتا ہے۔ قرآن میں بتایا گیا ہے کہ خدا کے حکم کے باوجود جب ابلیس، آدم (انسانِ اوّل) کے سامنے نہیں جھکا، تو خدا نے ابلیس کو ملعون قرار دیا۔ اِس پر غصہ ہو کر ابلیس نے کہا کہ میں انسان کو تیرے راستے سے بھٹکاؤں گا میں ان کی اکثریت کو تیری رحمت سے دور کردوں گا (لَأُزَيِّنَنَّ لَهُمْ فِي الْأَرْضِ وَلَأُغْوِيَنَّهُمْ أَجْمَعِينَ) الحجر، 15:39۔ اِس آیت میں 'اِغوا' کا لفظ ہے۔ اغوا کے لفظی معنی ہیں سیدھے راستے سے بھٹکانا۔ اِس کا مطلب یہ ہے کہ ابلیس کے لیے جہنم مقدر ہوگئی، اِس لیے انتقامی جذبے کے تحت اس نے کہا کہ میں تمام انسانوں کو تیرے راستے سے منحرف کردوں گا:

I will certainly cause them all to deviate.

ابلیس کے پاس انسان کو بھٹکانے کے لیے مختلف طریقے ہیں۔ ان میں سے ایک طریقہ وہ ہے جو خاص طور پر اہلِ ایمان کے ساتھ مخصوص ہے۔ اہلِ ایمان کی امتیازی صفت یہ ہے کہ وہ پیغمبرِ آخرالزماں کے بعد داعی الی اللہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ یہ حیثیت بیک وقت دو اعتبار سے نہایت اہم ہے۔ ایک، یہ کہ اگر دعوت الی اللہ کا کام رک جائے تو عام انسانوں کے لیے جنت کی طرف رہنمائی کا عمل ختم ہوجائے گا۔ دوسرے، یہ کہ دعوتی عمل چھوڑنے کی صورت میں خود اہلِ ایمان اپنی اہم ترین حیثیت کھو دیں گے۔ اس لیے اہلِ ایمان کے سلسلے میں ابلیس کی ہمیشہ یہ کوشش ہوتی ہے کہ وہ اُنھیں دعوت الی اللہ کے کام سے غافل کردے۔

ابلیس یہ کام کس طرح کرتا ہے، اُس کا جواب 'اغوا' کے لفظ میں موجود ہے، جس کو ابلیس نے اپنے چیلنج کے وقت استعمال کیا تھا۔ اغوا کا لفظی مطلب انحراف (deviation) ہے۔ اِس سے یہ

معلوم ہوتا ہے کہ اِس معاملے میں ابلیس کا طریقہ کیا ہے۔ وہ طریقہ توجہ کو پھیرنا (distraction) ہے۔ اِس کوشش میں اُس کا انحصار تزئین پر ہوتا ہے، یعنی دعوت کے سوا کسی اور چیز کو مزیّن کر کے یہ کوشش کرنا کہ لوگ دعوتی راستے کو چھوڑ کر کسی اور راستے کی طرف سرگرم ہوجائیں۔ دعوتی کام کی اہمیت کو گھٹانا، اور غیر دعوتی کام کی اہمیت کو بڑھانا، یہ اِس معاملے میں ابلیس کا خاص حربہ ہے، جس کو وہ ہر زمانے کے مسلمانوں کے اوپر استعمال کرتا ہے۔

دوسری عالمی جنگ نے نوآبادیاتی طاقتوں کو اتنا کمزور کردیا کہ وہ ایشیا اور افریقہ میں اپنے سیاسی قبضے کو باقی رکھنے کے قابل نہ رہے۔ چنانچہ دھیرے دھیرے نوآبادیاتی دور کا خاتمہ ہوگیا۔ نوآبادیاتی دور نے مغل سلطنت اور عثمانی سلطنت کا خاتمہ کیا تھا، اِس کے نتیجے میں عالمی سطح پر مسلمانوں کے اندر مغربی قوموں کے خلاف منفی ذہن پیدا ہوگیا۔ سیاسی ایمپائر کو کھونے کا غم مسلمانوں کے ذہن میں اتنی قوت سے بیٹھ گیا تھا کہ وہ یہ بھی بھول گئے کہ نوآبادیاتی دور کے خاتمے نے اُن کو نئی سیاسی زندگی دے دی ہے۔

پہلے اگر مسلمانوں کے خیال کے مطابق، انھوں نے اپنے پولیٹکل ایمپائر کو کھویا تھا تو اب قومی ریاستوں (nation states) کی صورت میں اُس کو دوبارہ انھوں نے مزید اضافے کے ساتھ حاصل کرلیا ہے۔ چنانچہ اب زمین کے مختلف حصوں میں 57 مسلم ریاستیں قائم ہیں۔ اِن مختلف ریاستوں کو آج جو ذرائع حاصل ہیں، وہ قدیم زمانے میں کسی بھی مسلم ایمپائر کو حاصل نہ تھے۔

جدید حالات نے مسلمانوں کے لیے دعوت کے نقطۂ نظر سے بہت سے نئے امکانات کھول دیے تھے۔ مثلاً کمیونی کیشن، مذہبی آزادی، عالمی انٹر یکشن، وغیرہ۔ لیکن مسلمان اِن جدید مواقع کو دعوت الی اللہ کے لیے استعمال نہ کرسکے۔ دوبارہ ایسا ہوا کہ وہ مختلف قسم کے انحرافات (distractions) کا شکار ہوگئے، اور دعوت کے راستے سے بھٹک کر دوسرے غیر دعوتی راستوں میں سرگرم ہوگئے۔ مثلاً مدعو سے نفرت اور متشددانہ ٹکراؤ، مدعو پر اپنی برتری قائم کرنے کے لیے مناظرہ، اپنا علاحدہ قومی تشخص برقرار رکھنے کے لیے کمیونٹی ورک، وغیرہ۔

موجودہ زمانے میں تقریباً عالمی پیمانے پر مسلم رہنماؤں نے یہ غلطی کی ہے کہ ہر جگہ سیاسی شکایتوں کو لے کر انھوں نے لڑائی چھیڑ دی، کہیں غیر مسلم قوموں سے اور کہیں خود اپنی سرزمین کے مسلم حکمرانوں سے۔ یہ لڑائی مسلم حکومتوں نے نہیں، بلکہ مسلم رہنماؤں نے اس کی قیادت کی۔ یہ بلاشبہ ایک غیر اسلامی فعل تھا۔ غیر مسلم قوموں سے مسلمانوں کو سیاسی، یا قومی شکایتیں لے کر لڑنا نہیں ہے، بلکہ شکایتوں کو نظر انداز کرکے پُرامن طور پر اُنھیں دعوتِ حق کا مخاطب بنانا ہے۔ سیاسی اور قومی شکایتوں کی بنیاد پر مدعو قوموں سے لڑائی چھیڑنا بلاشبہ اسلامی تعلیمات کے خلاف ہے۔ قرآن میں واضح طور پر یہ حکم دیا گیا ہے کہ مدعو کی طرف سے پیش آنے والی ایذاؤں پر صبر کرو۔ شکایتی باتوں کو نظر انداز کرتے ہوئے، مثبت انداز میں انھیں حق کا پیغام پہنچاتے رہو۔

یہی معاملہ مسلم حکمرانوں کا ہے۔ علما کے اتفاقِ رائے کے مطابق، مسلم حکمرانوں کے خلاف خروج کرنا حرام ہے۔ اِس معاملے میں مسلم رہنماؤں کے لیے کرنے کا کام صرف ایک ہے، وہ یہ کہ مسلم حکمرانوں سے سیاسی ٹکراؤ نہ کرتے ہوئے، دعوت اور تعلیم کے میدان میں پُرامن جدو جہد کریں اور ایسا کرتے ہوئے مرجائیں — مگر موجودہ زمانے میں علما اور رہنماؤں کی بڑی اکثریت نے اِس کے خلاف عمل کیا۔ اِس کے نتیجے میں دعوت الی اللہ کا کام انجام نہ پاسکا، حالاں کہ وہ مسلمانوں کے اوپر فرض کے درجے میں ضروری تھا۔

مسلمانوں کا ایک اور گروہ ہے جس نے مسلم ٹکراؤ کا کام تو نہیں کیا، لیکن انھوں نے ایک اور کام کیا جو عملی ٹکراؤ سے کم نقصان دہ نہ تھا۔ یہ مناظرہ یا ڈبیٹ (debate) ہے۔ یہ لوگ متشدّدانہ ہتھیار استعمال نہیں کرتے، البتہ وہ اسٹیج پر لفظوں کے ذریعے وہی کام انجام دے رہے ہیں، جو دوسرے لوگ مقابلے کے میدان میں ہتھیاروں کے ذریعے انجام دے رہے ہیں۔ اِس قسم کے لوگ اپنے کام کو دعوت کا عنوان دیے ہوئے ہیں، حالاں کہ وہ دعوت نہیں ہے، بلکہ وہ مناظرہ یا ڈبیٹ ہے، اور مناظرہ یا ڈبیٹ کا دعوت سے کوئی تعلق نہیں۔

اصل یہ ہے کہ موجودہ زمانے کے مسلمان شکست خوردہ نفسیات (defeatist mentality)

میں مبتلا ہیں۔ وہ شعوری یا غیر شعوری طور پر اِس احساس میں جی رہے ہیں کہ وہ دوسری قوموں کے مقابلے میں شکست کھا گئے ہیں۔ اب ایک خطیب اسٹیج پر کھڑا ہوتا ہے اور وہ لفظوں کی دنیا میں فاتحانہ مظاہرہ کرکے مسلمانوں کو یہ تسکین دیتا ہے کہ خواہ مقابلے کے میدان میں ہم دوسروں سے ہار چکے ہوں، لیکن اسٹیج کے اوپر ہم اُن کو شکست دے رہے ہیں۔ یہی نفسیات ہے جس کی بنا پر مسلمان ایسے خطیبوں کی باتوں پر تالیاں بجاتے ہیں اور اُس وقت خوب خوش ہوتے ہیں، جب کہ خطیب اسٹیج پر کھڑا ہوکر یہ کہتا ہے —اِن سب لوگوں کے اوپر بلڈوزر چلادو:

Bulldoze them all!

* * * * * * * *

حقیقت یہ ہے کہ موجودہ زمانہ میں وسیع پیمانہ پر یہ امکان پیدا ہوا ہے کہ آج کے انسان کو اسلام کی دعوت دی جائے۔ مگر یہ اُسی وقت ممکن ہے جب کہ انسان کو اسلام پھولوں کا ایک گلدستہ معلوم ہو نہ کہ کانٹوں کا ایک مجموعہ۔ وہ جب اسلام کا تعارف پائے تو اسے محسوس ہو کہ وہ اس کے اپنے دل کی آواز ہے۔ یہ عین وہی دینِ رحمت ہے جس کی تلاش میں وہ مدتوں سے سرگرداں تھا۔ اس کے لیے داعی کو مدعو کی زیادتیوں پر یک طرفہ صبر کرنا ہے۔ یہ صبر اس لیے ہوتا ہے تاکہ داعی اور مدعو کے درمیان اعتدال کی فضا باقی رہے، وہ کسی حال میں بگڑنے نہ پائے۔ آج کا انسان مذہبِ امن کی تلاش میں ہے۔ ایسی حالت میں اہل اسلام کو یک طرفہ صبر کرکے ہر حال میں ٹکراؤ کی روش سے باز رہنا ہے، تاکہ اسلام کے مذہبِ امن ہونے کی حیثیت مدعو کی نظر میں مجروح نہ ہونے پائے۔ آج کا انسان دینِ روحانیت کی تلاش میں ہے۔ ایسی حالت میں اسلام کے داعیوں کو آخری حد تک اس سے پرہیز کرنا ہے کہ وہ اسلام کو اس انداز سے پیش کریں کہ جدید انسان کو وہ صرف سیاسی اور حکومتی نظام کی کوئی اسکیم نظر آئے۔ آج کا انسان اسلام کے دروازہ پر کھڑا ہوا ہے، اپنی حقیقت کے اعتبار سے وہ صرف اسلام کا طالب ہے۔ دعوت کا عمل اگر درست طور پر کیا جائے تو بیشتر انسان اسلام کو اپنے دل کی آواز پائیں گے۔

اسلام دورِ جدید میں

اسلام چونکہ آخری دین ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ وہ اپنے وجود کے اعتبار سے قیامت تک باقی رہے۔ اسی لیے دین کا تحفظ بھی ایک ضروری اور مطلوب کام ہے۔ موجودہ زمانہ کی بعض تحریکوں نے اس اعتبار سے یقیناً مفید خدمات انجام دی ہیں۔ وہ اسلام کے فکری اور عملی نقشے کی محافظ ثابت ہوئی ہیں۔ بعض ادارے قرآن اور حدیث اور اسلامی مسائل کے علم کو زندہ رکھے ہوئے ہیں۔ بعض جماعتیں اسلامی عبادات کے ڈھانچہ کو ایک نسل سے دوسری نسل تک پہنچانے کا کام کررہی ہیں۔ کچھ اور ادارے قرآن وحدیث کا متن صحت وصفائی کے ساتھ چھاپ کر ہر جگہ پھیلا رہے ہیں۔ یہ تمام کام بجائے خود مفید ہیں، مگر بہر حال وہ تحفظ دین کے کام ہیں نہ کہ دعوتِ دین کے کام۔ جہاں تک اسلام کو دعوتی قوت کی حیثیت سے زندہ کرنے کا سوال ہے، وہ موجودہ زمانہ میں ابھی تک واقعہ نہ بن سکا۔ حتی کہ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ لوگوں کو شاید اس کا شعور بھی نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اکثر ایسے کاموں کو اسلامی دعوت کا عنوان دے دیتے ہیں جن کا اسلامی دعوت سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔

موجودہ زمانہ میں کسی حقیقی اسلامی کام کے آغاز کی پہلی شرط یہ ہے کہ ہم اس صورت حال کو ختم کریں جس نے ساری دنیا میں اسلامی تحریک کو سیاسی تحریک کے ہم معنی بنا رکھا ہے۔ مسلمان ہر ملک میں وقت کے حکمرانوں کے خلاف شور وشر برپا کرنے میں مشغول ہیں۔ کہیں ان کی یہ تحریک غیر مسلم اقتدار کے خلاف برپا ہے، اور کہیں وہ ایک اسلامی سیاسی فلسفہ کے زیر سایہ کام کررہی ہے اور کہیں فلسفہ اور نظریہ کے بغیر متحرک ہے۔ کہیں اس نے ملّی عنوان اختیار کررکھا ہے اور کہیں نظامی عنوان۔ تاہم سارے فرق واختلاف کے باوجود نتیجہ سب کا ایک ہے — حریفوں کے خلاف محاذ کے نام سے نقصان میں اضافہ کرتے رہنا۔ اس اعتبار سے دیکھیے تو مسلمانوں نے موجودہ زمانہ میں بالکل الٹی کارکردگی کا ثبوت دیا ہے۔ خدا نے دعوتِ حق کی راہ سے سیاسی رکاوٹ کو دور کرکے انھیں موقع دیا تھا کہ وہ آزادانہ حالات میں خدا کے تمام بندوں تک خدا کا پیغام پہنچا دیں۔ وہ خدا کے بندوں کو خدا

کی اس اسکیم سے باخبر کر دیں جس کے تحت اس نے انسان کو پیدا کیا ہے اور جس کے مطابق وہ ایک ایک شخص کا حساب لینے والا ہے۔ مگر انھوں نے دوبارہ نئے نئے عنوان سے اپنے خلاف سیاسی رکاوٹیں کھڑی کرلیں۔ خود ساختہ سیاسی جہاد میں ہر ایک مشغول ہے۔ مگر دعوتی جہاد میں اپنا حصہ ادا کرنے کی فرصت کسی کو نہیں۔

قرآن میں ہے کہ اللہ اس کی مدد کرتا ہے جو اللہ کی مدد کرے (الحج، 22:40)۔ ہر دور میں خدا اپنے دین کے حق میں کچھ امکانات کھولتا ہے۔ اس وقت ضرورت ہوتی ہے کہ کچھ لوگ ہوں جو خدا کے اشارہ کو سمجھیں، اور خدا کے منصوبہ میں اپنے آپ کو شامل کر دیں۔ صحابہ کرام وہ خوش نصیب لوگ ہیں، جنھوں نے اپنے زمانہ میں خدائی منصوبہ کو سمجھا، اور اپنے آپ کو پوری طرح اس کے حوالہ کر دیا۔ اس کا نتیجہ وہ عظیم انقلاب تھا جس نے انسانی تاریخ کے رخ کو موڑ دیا۔

بارش کا آنا خدا کے ایک منصوبہ کا خاموش اعلان ہے۔ یہ کہ آدمی اپنا بیج زمین میں ڈالے تاکہ خدا اپنے کائناتی انتظام کو اس کے موافق کر کے اس کے بیج کو ایک پوری فصل کی صورت میں اس کی طرف لوٹائے۔ کسان اس خدائی اشارہ کو فوراً سمجھ لیتا ہے، اور اپنے آپ کو اس خدائی منصوبہ میں پوری طرح شامل کر دیتا ہے۔ اس کا نتیجہ ایک لہلہاتی ہوئی فصل کی صورت میں اس کو واپس ملتا ہے۔ اسی طرح موجودہ زمانہ میں، ہزار سالہ عمل کے نتیجہ میں، اللہ تعالی نے اپنے دین کے حق میں کچھ نئے مواقع کھولے تھے۔ یہ مواقع کہ اقتدار کا حریف بنے بغیر توحید اور آخرت کی دعوت کو عام کیا جائے۔ جو کام پہلے معجزاتی سطح پر انجام دینا پڑتا تھا، اس کو عام طبیعیاتی استدلال کی سطح پر انجام دیا جائے۔ جو کام پہلے تعصب کے ماحول میں کرنا پڑتا تھا، اس کو مذہبی رواداری کے ماحول میں کیا جائے۔ جو کام پہلے ''حیوانی رفتار'' سے کیا جاتا تھا اس کو ''مشینی رفتار'' کے ساتھ انجام دیا جائے۔

یہ موجودہ زمانہ میں خدا کا منصوبہ تھا۔ خدا نے سارے بہترین امکانات کھول دیے تھے اور اب صرف اس کی ضرورت تھی کہ خدا کے کچھ بندے ان کو استعمال کر کے ان امکانات کو واقعہ بننے کا موقع دیں۔ مگر مسلم قیادت خدا کے اس منصوبہ میں شامل ہونے کے لیے تیار نہ ہوئی۔ اس نے نئے

نئے عنوانات کے تحت وہی سیاسی جھگڑے دوبارہ چھیڑ دیے، جن کو خدا نے ہزار سالہ عمل کے نتیجہ میں ختم کیا تھا۔ انھوں نے اسلامی دعوت کو سیاسی اور قومی دعوت بنا کر دوبارہ اسلام کو اقتدار کا حریف بنا دیا اور کہا کہ یہی عین خدا کا پسندیدہ دین ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مدعو قوموں کے ساتھ ہر جگہ بالکل بے فائدہ قسم کی مقابلہ آرائی شروع ہوگئی، اور سارے نئے امکانات غیر استعمال شدہ حالت میں پڑے رہ گئے۔ مسلمانوں اور دیگر قوموں کے درمیان داعی اور مدعو کا رشتہ قائم نہ ہوسکا۔

کام کی ایک سو سال سے بھی زیادہ لمبی مدت مسلمانوں نے کھودی۔ یہاں تک کہ شیطان نے دوبارہ قدیم شرک کی جگہ جدید شرک (کمیونزم) کو کھڑا کر دیا۔ اب کم از کم کمیونزم کے زیر تسلط علاقوں میں دوبارہ کام کرنے کی وہی مشکلات پیدا ہوگئی ہیں، جو اس سے پہلے شرک کے زیر تسلط علاقوں میں پائی جاتی تھیں۔ تاہم غیر کمیونسٹ دنیا میں اب بھی کام کے مواقع کھلے ہوئے ہیں، اور یہاں پندرھویں صدی ہجری میں اس صالح جدوجہد کا آغاز کیا جاسکتا ہے جو چودھویں صدی ہجری میں نہ کیا جاسکا۔

* * * * * * *

یہود کا ذکر قرآن میں اصلاً خود یہود کے لیے نہیں ہے۔ قرآن میں یہود کا لفظ بطور مثال ہے۔ یہود کی مثال سے امتِ محمدی کو متنبہ کیا گیا ہے کہ تم اس انجام سے اپنے آپ کو بچاؤ۔ اس کا اشارہ قرآن کی اس آیت میں ملتا ہے: (ترجمہ) کیا ایمان والوں کے لیے وہ وقت نہیں آیا کہ ان کے دل اللہ کی نصیحت کے آگے جھک جائیں۔ اور اس حق کے آگے جو نازل ہو چکا ہے، اور وہ ان لوگوں کی طرح نہ ہوجائیں جن کو پہلے کتاب دی گئی تھی، پھر ان پر لمبی مدت گزر گئی تو ان کے دل سخت ہوگئے (فَطَالَ عَلَيۡهِمُ الۡأَمَدُ فَقَسَتۡ قُلُوبُهُمۡ)، اور ان میں سے اکثر لوگ نافرمان ہیں (57:16)۔ یہ کسی امت کے دورِ زوال کی بات ہے، جو طول اَمد کے بعد فطرت کے قانون کے مطابق لازماً پیدا ہوتا ہے۔ اس دور تک پہنچنے کے بعد امت کے افراد میں ایمان کا شعور ایک رسمی شعور بن جاتا ہے۔ اس دور میں امت کے افراد کے اندر آخرت کا زندہ احساس باقی نہیں رہتا۔ اس دور تک پہنچنے کے بعد امت کے افراد میں خشیت (ڈر) کی صفت باقی نہیں رہتی۔ ان کے لیے ایمان ایک رسمی عقیدہ بن جاتا ہے۔

فراہی اسکول کا کنٹری بیوشن

مولانا حمید الدین فراہی (1863-1930) قرآن کی تفسیر میں ایک تفسیری اسکول کے بانی سمجھے جاتے ہیں۔ اگرچہ مولانا حمید الدین فراہی اپنی فکر کی بنیاد پر کوئی مکمل تفسیر قرآن نہ لکھ سکے۔ لیکن ان کے انقلابی فکر سے بہت سے اہل علم کو ذہنی تحریک ملی، اور انھوں نے قرآن کی تفسیر میں بہت سے قیمتی نکتے دریافت کیے۔

مولانا حمید الدین فراہی کے منہج کو اختیار کرنے والوں میں سے ایک مولانا جلیل احسن ندوی اصلاحی (1914-1981) تھے۔ انھوں نے قرآن کی ایک آیت کی تفسیر میں ایک اشکال کو نہایت خوبی کے ساتھ دور کیا ہے۔ اس نکتے کو میں نے اپنی تفسیر تذکیر القرآن میں اس طرح درج کیا ہے:

برادران یوسف روانہ ہونے لگے تو حضرت یوسف نے ازراہ محبت اپنا پانی پینے کا پیالہ (جو غالباً چاندی کا تھا) اپنے بھائی بن یامین کے سامان میں رکھ دیا۔ اس کی خبر نہ بن یامین کو تھی اور نہ دربار والوں کو۔ اس کے بعد خدا کی قدرت سے ایسا ہوا کہ غلہ ناپنے کا شاہی پیمانہ (جو خود بھی قیمتی تھا) کہیں ادھر ادھر (misplace) ہو گیا۔ تلاش کے باوجود جب وہ نہیں نکلا تو کارندوں کا شبہ برادرانِ یوسف کی طرف گیا جو ابھی ابھی یہاں سے روانہ ہوئے تھے۔ ایک کارندہ نے آواز دے کر قافلہ کو بلایا۔ پوچھ گچھ کے دوران انہوں نے بطور خود چوری کی وہ سزا تجویز کی جو شریعتِ ابراہیمی کی رو سے ان کے یہاں رائج تھی۔ یعنی جو سارق ہے وہ ایک سال تک مالک کے یہاں غلام بن کر رہے۔

اس کے بعد کارندے نے تلاشی شروع کی۔ اب غلہ کا پیمانہ تو ان کے یہاں نہیں ملا۔ مگر دربار کی ایک اور خاص چیز (چاندی کا پیالہ) بن یامین کے سامان سے برآمد ہو گیا۔ چنانچہ بن یامین کو حسبِ فیصلہ حضرت یوسف کے حوالہ کر دیا گیا۔ اگر شاہ مصر کے قانون پر فیصلہ کی قرارداد ہوئی ہوتی تو حضرت یوسف اپنے بھائی کو نہ پاتے۔ کیونکہ شاہ مصر کے مروجہ قانون میں چور کی سزا یہ تھی کہ اس کو مارا جائے، اور مسروقہ چیز کی قیمت اس سے وصول کی جائے۔ اس واقعہ میں حضرت یوسف کی نیت

شامل نہ تھی، یہ خدائی تدبیر سے ہوا اس لیے خدا نے اس کو اپنی طرف منسوب فرمایا۔

نوٹ: بن یامین کے سامان میں سقایہ رکھا گیا تھا، جس کی ضمیر ھا ہے۔ مگر شاہی کارندہ صواع تلاش کر رہا تھا جس کی ضمیر ''ہ'' ہے۔ اب تلاش کے بعد کارندہ نے جو چیز برآمد کی اس کے لیے قرآن میں ضمیر ''ھا'' استعمال ہوئی ہے (ثُمَّ اسْتَخْرَجَهَا مِنْ وِعَاءِ أَخِيهِ)۔ ضمیر کا یہ فرق بتاتا ہے کہ تلاش کے بعد بن یامین کے سامان سے سقایہ نکلا تھا نہ کہ صواع۔ (تذکیر القرآن، سورہ یوسف: 76-69)

اسی طرح مولانا فراہی کے شاگرد مولانا امین احسن اصلاحی (1997-1904) نے مولانا فراہی کے منہج تفسیر پر چلتے ہوئے قرآن کے کئی تفسیری نکتے نہایت خوبی کے ساتھ واضح کیے ہیں۔ اس کی ایک مثال یہ ہے:

لِأُنْذِرَكُمْ بِهِ وَمَنْ بَلَغَ، عام طور پر مفسرین نے وَمَنْ بَلَغَ کو ضمیر منصوب پر معطوف مانا ہے یعنی یہ قرآن اس لیے مجھ پر وحی کیا گیا ہے کہ میں اس کے ذریعے سے تم کو اور ان سب کو بیدار و ہوشیار کروں جن تک یہ پہنچے۔ لیکن ہمارا خیال یہ ہے کہ یہ ضمیر متکلم پر معطوف ہے یعنی میں اس کے ذریعے سے تم کو خبردار کروں اور جن کو یہ پہنچے وہ بھی اپنی اپنی جگہ پر دوسروں کو اس کے ذریعے سے خبردار کریں۔ یہ گویا اس ذمہ داری کی یاددہانی ہے جس کا ذکر دوسرے مقام میں یوں ہوا ہے فَلَوْلَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِنْهُمْ طَائِفَةٌ لِيَتَفَقَّهُوا فِي الدِّينِ وَلِيُنْذِرُوا قَوْمَهُمْ إِذَا رَجَعُوا إِلَيْهِمْ (توبہ: 122) پس ایسا کیوں نہ ہوا کہ ان کے ہر گروہ میں سے ایک جماعت دین کا علم حاصل کرنے کے لیے اٹھتی اور تا کہ وہ اپنی قوم کو خبردار کرتی جب کہ ان کی طرف واپس آتی۔ یہی حقیقت احادیث میں بھی واضح کی گئی ہے۔ چنانچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے تمام صحابہ پر انذار و تبلیغ کی ذمہ داری ڈالی اور فرمایا فلیبلغ الشاھد الغائب۔ پس چاہیے کہ جو لوگ موجود ہیں وہ ان لوگوں کو پہنچا دیں جو موجود نہیں ہیں۔ لِتَكُونُوا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُونَ الرَّسُولُ عَلَيْكُمْ شَهِيدًا میں اس امت کا جو فریضہ منصبی بیان ہوا ہے اور جس کی وضاحت ہم اس کے مقام میں کر چکے ہیں، اس سے بھی اسی مفہوم کی تائید نکلتی ہے جس کی طرف ہم نے اشارہ کیا ہے۔ (تدبر قرآن، سورہ الانعام: 19)

عظیم قربانی

اسلام کی تاریخ میں دو عظیم قربانی مقدر تھی۔ قربانی کے ان دونوں واقعات سے اسلام کی دوررس تاریخ بننے والی تھی۔ پہلی قربانی مکمل طور پر پیش آچکی ہے۔ دوسری قربانی کے پیش آنے کا تاریخ کو انتظار ہے۔ اس دوسری قربانی کا وقت آخری طور پر آ گیا ہے۔ پہلی قربانی ایک پراسس (process) کی صورت میں پیش آچکی ہے۔ دوسری قربانی دوبارہ اسی طرح پراسس کی صورت میں پیش آئے گی، اور یہ پراسس عملاً شروع ہو چکا ہے۔

پہلی قربانی وہ تھی، جو ابراہیم، اسماعیل اور ہاجرہ کے ذریعے پیش آئی، اور اس کے انقلابی نتائج کا تجربہ ساری دنیا کو پیش آرہا ہے۔ اس عظیم قربانی کا ذکر قرآن میں ان الفاظ میں آیا ہے:

وَفَدَيْنَاهُ بِذِبْحٍ عَظِيمٍ (37:107)۔ یعنی ہم نے اس کو ایک عظیم قربانی کے عوض چھڑا لیا۔

پیغمبر ابراہیم کا زمانہ تقریباً ساڑھے چار ہزار سال پہلے کا زمانہ ہے۔ وہ قدیم عراق میں پیدا ہوئے۔ اس وقت دنیا میں مطلق شہنشاہیت (despotism) کا دور تھا۔ کچھ سیاسی خاندانوں نے جابرانہ بادشاہت قائم کر رکھی تھی۔ ان کے پاس نہایت طاقت ور فوجیں ہوا کرتی تھیں۔ وہ اپنے خلاف بغاوت کو طاقت سے کچل دیتے تھے۔ اس دور میں دو بڑی بادشاہتیں قائم ہوگئی تھیں— بازنطینی سلطنت (Byzantine Empire) اور ساسانی سلطنت (Sassanid Empire)۔

پیغمبر ابراہیم، ان کے بیٹے اسماعیل اور ان کی بیوی ہاجرہ کی غیر معمولی قربانی کے ذریعے عرب کے صحرا میں ایک قوم تیار ہوئی۔ اس قوم کو ایک مستشرق نے نرسری آف ہیروز کا نام دیا ہے۔ یہ قوم ابراہیم اور اسماعیل کی قربانی سے عرب میں بنی، پھر اس قوم کا ٹکراؤ مذکورہ دونوں سلطنتوں سے ہوا۔ اس سے پہلے خود ان دونوں سلطنتوں کا باہمی ٹکراؤ پیش آیا، جس کے نتیجے میں دونوں سلطنتیں کمزور ہوگئیں۔ اس واقعے کا ذکر قرآن کی سورہ الروم کی ابتدا میں کیا گیا ہے۔ اس کے بعد اس عرب نسل کو ،جس کو بنو اسماعیل کہا جاتا ہے، یہ موقع ملا کہ وہ دونوں سلطنتوں کو ایک کے بعد ایک شکست دے کر

ان کا زور پوری طرح توڑ دیں۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ اب ان جابر سلطنتوں کا زور ساری دنیا سے پوری طرح ختم ہو گیا، اور ساری دنیا میں آزادی کا دور آ گیا۔

دوسرے دور کا انقلاب بالقوۃ طور پر (potentially) پیش آ چکا ہے۔ اب اس پوٹنشل کو اویل (avail) کرنا ہے۔ یہ پوٹنشل موجودہ زمانے کا وہ انقلاب ہے، جس کو دورِ مواصلات (age of communication) کہا جاتا ہے۔ اس انقلاب کی بنا پر پہلی بار تاریخ میں کسی مشن کی عالمی اشاعت کا موقع پیدا ہوا ہے۔ اس دور کو قرآن کی اشاعت کے لیے بھرپور طور پر استعمال کرنا ہے۔ حدیث میں جس واقعے کو شہادتِ اعظم (صحیح مسلم، حدیث نمبر 2938) کہا گیا ہے، اس سے مراد یہی گلوبل دعوہ (global dawah) ہے۔ اسی گلوبل دعوہ کو موجودہ ایج آف کمیونی کیشن میں آخری آسمانی کتاب قرآن کے حق میں استعمال کرنا ہوگا، اور پھر انسان کے اوپر آخری حجت تمام ہو جائے گی۔

جو لوگ اس امکان کو دریافت کریں، اور قربانی کی سطح پر اس کو بروئے کار لانے کی جدوجہد کریں، ان کے لیے تاریخ کا عظیم ترین انعام مقدر ہے۔ یہ واقعہ حدیث کے الفاظ میں اللہ کے نزدیک شہادتِ اعظم ہوگا، اور اس کے لیے اللہ کی طرف سے جزائے اعظم، یعنی اعلیٰ فردوس کا فیصلہ کیا جائے گا۔

دورِ آخر کی یہ شہادت اعظم کسی مسلح کارروائی کے ذریعے نہیں ہوگی۔ یہ مکمل طور پر ایک پرامن واقعہ ہوگا۔ اس واقعے کو بروئے کار لانے میں پیش کرنے والے جو قربانی پیش کریں گے، وہ گردن کاٹنا یا کٹوانا نہیں ہوگا، یہ تمام تر ایک پرامن جدوجہد (peaceful struggle) کے ذریعے وجود میں آئے گا۔ یہ امنگوں کی قربانی (sacrifice of aspirations) کا معاملہ ہوگا۔

شہادتِ اعظم یا عالمی دعوت کا یہ واقعہ اس طرح ہوگا کہ اس کے لیے کچھ لوگ اپنے آپ کو بھرپور طور پر وقف (dedicate) کریں گے، وہ اپنی اعلیٰ ذہنی صلاحیت کو اپنی ذات کے لیے استعمال کرنے کے بجائے دعوتی مشن کے لیے استعمال کریں گے۔

دعوہ ایکسپلوزن

پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کا مشن دعوتِ توحید کا مشن تھا۔ آپ نے 610 عیسوی میں مکہ میں اپنا مشن شروع کیا۔ یہ زمانہ پرنٹنگ پریس سے بہت پہلے کا زمانہ تھا۔ اس زمانے میں ایسے لوگ بہت کم ہوتے تھے، جو کسی لکھی ہوئی چیز کو پڑھ سکیں۔ مورخ بلاذری نے لکھا ہے کہ رسول اللہ کے زمانے میں قریش میں صرف 17 لوگ ایسے تھے جو لکھنا پڑھنا جانتے تھے (عن أَبِي بكر بْن عَبْد اللَّهِ بْن أبی جهم العدوی قال: دخل الإسلام وفي قريش سبعة عشر رجلا كلهم يكتب) فتوح البلدان للبَلَاذری، ص 453، بیروت، 1988

رسول اور اصحاب رسول اگر لکھی ہوئی کتاب کو پڑھوانے کے ذریعہ اپنا مشن پھیلاتے تو تیزی کے ساتھ اسلام کی اشاعت نہیں ہوسکتی تھی۔ اس وقت رسول اور اصحاب رسول نے جو فطری طریقہ اختیار کیا، وہ تھا پڑھ کر سنانا۔ عربوں کی زبان عربی تھی۔ سارے عرب کے لوگ عربی زبان سمجھتے، اور بولتے تھے۔ اس کے مقابلے میں ایسے لوگ بہت کم تھے، جو کتاب کو خود سے پڑھ کر دعوت کو سمجھیں، اور اس کو اختیار کریں۔ رسول اللہ نے اس زمانے میں عملی طریقہ اختیار کیا، اور وہ تھا قرآن کو پڑھ کر سنانا۔ آپ کا طریقہ یہ تھا کہ آپ عربوں کے چھوٹے اور بڑے اجتماعات میں جاتے اور لوگوں کو قرآن پڑھ کر سناتے، اس طرح بہت جلد قرآن کا پیغام سارے عرب میں پھیل گیا۔

یہی صورت حال الرسالہ کے دعوتی مشن کی ہے۔ ماہنامہ الرسالہ کی زبان اردو ہے۔ اسی طرح اس مشن کے لیے جو کتابیں تیار کی گئی ہیں، وہ بھی زیادہ تر اردو زبان میں ہیں۔ موجودہ زمانے میں ایسے لوگ نسبتاً بہت کم ہیں، جو اردو زبان میں لکھی ہوئی کتابوں کو پڑھ کر سمجھیں، لیکن دوسری طرف اس کا مثبت پہلو یہ ہے کہ اردو زبان کے بولنے اور سمجھنے والے دنیا کے اکثر ملکوں میں پھیلے ہوئے ہیں۔ ایسے لوگوں کی تعداد بہت زیادہ ہے، جو اگرچہ اردو کتاب نہیں پڑھ سکتے، لیکن وہ سن کر بخوبی طور پر اردو زبان کو سمجھ سکتے ہیں۔

اس صورتِ حال میں الرسالہ مشن سے وابستہ لوگوں کے لیے دعوت کا ایک سنہری موقع موجود ہے، اور وہ ہے ماہنامہ الرسالہ یا اس سے متعلق اردو کتابوں کو پڑھ کر لوگوں کو سنانا۔ اس طرح وہ رسول اور اصحاب رسول کی سنت کو دوبارہ زندہ کرنے کا کریڈٹ پاسکتے ہیں۔ مزید یہ کہ ٹکنالوجی نے موجودہ زمانے میں اس کام کو بہت زیادہ آسان بنا دیا ہے۔ وہ یہ کہ وائس ریکارڈنگ کا طریقہ اختیار کرتے ہوئے، الرسالہ اور اس سے متعلق کتابوں کے مضامین کا ریکارڈ تیار کیا جائے، اور ان کو وسیع طور پر لوگوں کے درمیان پھیلایا جائے۔ اس طرح لوگوں کو یہ موقع ہوگا کہ وہ سن کر الرسالہ مشن سے واقفیت حاصل کریں۔ کار میں سفر کرتے ہوئے وہ آڈیو ریکارڈنگ کو سنیں۔

الرسالہ مشن سے جڑے ہوئے بہت سے لوگ عملاً اس طریقہ کو استعمال کررہے ہیں، وہ الرسالہ اور اس سے متعلق کتابوں کا آڈیو تیار کرکے لوگوں کو پہنچا رہے ہیں۔ مثلاً ڈاکٹر وقار عالم (امریکا)، مز شبانہ انصاری اور مسٹر سید خالد (پاکستان)، مولانا عبدالباسط عمری (قطر)، وغیرہ۔ تاریخ بتاتی ہے کہ ہر مشن میں ایک اس کا ابتدائی زمانہ ہوتا ہے۔ اس زمانے میں مشن استحکام کا درجہ حاصل کرتا ہے۔ اس کے بعد وہ وقت آتا ہے جس کو مشن کی توسیع عام کا زمانہ کہہ سکتے ہیں۔ الرسالہ مشن سے وابستہ لوگوں کے لیے یہ موقع ہے کہ وہ ماڈرن ٹکنالوجی کو استعمال کرتے ہوئے الرسالہ کی دعوت کو دعوہ ایکسپلوزن (Dawah Explosion) کے دور میں پہنچا دیں۔

1979 میں ایران کا انقلاب اسی طرح پیش آیا۔ آیت اللہ خمینی اس زمانے میں یورپ میں تھے۔ وہاں سے وہ اپنی تقریروں کے کیسٹ ایران بھیجتے تھے۔ یہ کیسٹ پورے ایران میں سنے جانے لگیں۔ ایران کے اس انقلاب کو کیسٹ ریولیوشن کہا جاتا ہے:

> A powerful and efficient network of opposition began to develop inside Iran, which smuggled cassette speeches by Khomeini, and used other means.

”کیسٹ ریوولیوشن“ کا یہ طریقہ بلاشبہ دعوت کے غیر سیاسی پر امن کام کے لیے کامیابی کے ساتھ دہرایا جاسکتا ہے۔

دنیا انتظار میں ہے

جولائی 1976 کی چھ تاریخ تھی اور شام 6 بجے کا وقت۔ میں شہر کی ایک سڑک سے گزر رہا تھا۔ اتنے میں ایک اجنبی دکان دار نے آواز دے کر مجھے روکا۔

"مرنے کے بعد کیا آدمی پھر اسی جیون میں واپس آتا ہے" اس نے پنجابی زبان میں سوال کیا۔

"نہیں"

"پھر کہاں جاتا ہے"

"اپنے مالک کے پاس چلا جاتا ہے حساب دینے کے لیے"۔

"اور اس کے بعد"

"اس کے بعد نرک میں جاتا ہے یا سورگ میں"۔ یہ جواب سن کر بوڑھے دکان دار نے اپنی سیٹ پر پہلو بدلا اور خاموش ہو گیا۔ اس کا چہرہ بتا رہا تھا کہ وہ کسی گہری سوچ میں پڑ گیا ہے۔ مجھے محسوس ہوا کہ اب کچھ اور بولنا اس کی سوچ میں خلل ڈالنا ہوگا۔ میں چند منٹ تک اس کے اگلے سوال کا منتظر رہا اور اس کے بعد آگے بڑھ گیا۔

اسی قسم کا ایک واقعہ مشہور امریکی مشنری بلی گراہم نے لکھا ہے۔ وہ اپنی کتاب "دی سیکرٹ آف ہیپی نس" میں لکھتا ہے کہ دنیا کے ایک عظیم سیاست داں نے ایک بار اس سے کہا:

> I am an old man. Life has lost all meaning. I am ready to take a fateful leap into the unknown. Young man, can you give me a ray of hope.

"میں بوڑھا ہو چکا ہوں۔ زندگی نے اپنی تمام معنویت کھو دی ہے۔ عنقریب میں نامعلوم دنیا کی طرف ایک فیصلہ کن چھلانگ لگانے والا ہوں۔ اے نوجوان شخص! کیا تم مجھے امید کی کوئی کرن

دے سکتے ہو۔‘‘

یہ موت ہر آدمی کا پیچھا کر رہی ہے۔ بچپن اور جوانی کی عمر میں آدمی اسے بھولا رہتا ہے۔ مگر بالآخر تقدیری فیصلہ غالب آتا ہے۔ بڑھاپے میں جب اس کی طاقتیں گھٹ جاتی ہیں، تب اسے محسوس ہوتا ہے کہ اب بہر حال کچھ دنوں کے بعد وہ مر جائے گا۔ اس وقت وہ مجبور ہوتا ہے کہ سوچے کہ ’’مرنے کے بعد کیا ہونے والا ہے‘‘۔ اسے تلاش ہوتی ہے کہ وہ کوئی امید کی کرن پالے جو موت کے بعد آنے والے حالات میں اس کو روشنی دے سکے۔

یہ زندگی کا اہم ترین سوال ہے، اس سے باخبر کرنے کے لیے اللہ نے اپنے تمام پیغمبر بھیجے۔ مگر آج جو لوگ پیغمبر کے وارث ہیں، وہ خود بھی شاید اس حقیقت کو بھول چکے ہیں۔ پھر ان سے کیا امید کی جائے کہ وہ دوسروں کو اس حقیقت سے باخبر کر سکیں گے۔

موت کے بعد انسان کے ساتھ کیا پیش آنا ہے، اسی کو بتانے کے لیے قرآن بھیجا گیا ہے۔ حاملینِ قرآن کی سب سے بڑی ذمہ داری یہ ہے کہ دنیا کو اس حقیقت سے باخبر کریں۔ اگر وہ اس کام کو نہ کریں تو قیامت کے دن جب قوموں کا حساب ہوگا وہ اس بات کے مجرم قرار پائیں گے کہ ان کے پاس انسانیت کے لیے اہم ترین خبر تھی مگر انھوں نے لوگوں کو اس سے آگاہ نہ کیا۔

****

حدیث میں آیا ہے کہ تم زمین والوں پر رحم کرو۔ آسمان والا تم پر رحم کرے گا (ارْحَمُوا مَنْ فِي الأَرْضِ يَرْحَمْكُمْ مَنْ فِي السَّمَاءِ) سنن الترمذی، حدیث نمبر 1924۔ اس رحمت کا تعلق صرف اخلاقی معاملات سے نہیں ہے۔ اس سے بھی زیادہ بڑھ کر اس کا تعلق دعوت الی اللہ سے ہے، یعنی لوگوں کو بتانا کہ وہ کون سی تدبیر ہے، جس کو اختیار کرکے وہ آخرت کی پکڑ سے بچ سکتے ہیں اور اللہ کی ابدی نعمتوں میں اپنا حصہ پا سکتے ہیں۔ اس واقعہ کی خبر بلاشبہ لوگوں کے حق میں رحمت وشفقت کا سب سے بڑا معاملہ ہے۔

امن کا مقصد

امن کا مقصد فوری فائدہ (immediate gain) حاصل کرنا نہیں ہے، بلکہ مواقع کو پیدا کرنا ہے۔ امن پسندی کا تقاضا یہ ہے کہ جہاں امن کا ماحول موجود ہو، اس کو انسانی ترقی کے لیے استعمال کرنا، اور اگر امن کے حالات موجود نہ ہوں، تو یک طرفہ کوشش کے ذریعے ایسے حالات پیدا کرنا، جو پرامن ماحول بنانے والے ہوں۔

مثلاً اگر کہیں دوقومی نظریہ کا کلچر پایا جاتا ہو، تو اس کو ختم کرنا، اور انسانی نظریے کو فروغ دینا۔ اگر کہیں مطالباتی سیاست کا رواج ہو، تو اس کو یک طرفہ اصلاح کے ذریعے ختم کرنا، اور جدید نظریے کے مطابق، پرامن اور صحت مند مسابقت کو رواج دینا، وغیرہ۔

جدید تہذیب کے تحت جو کلچر بنا ہے، وہ پرامن اور صحت مند مسابقت کا کلچر ہے۔ یہی کلچر اسلام میں بھی مطلوب ہے۔ مسلمانوں میں اگر کہیں اس کے برعکس کوئی کلچر پایا جاتا ہو، تو وہ قدیم قبائلی کلچر کی باقیات کے طور پر ہیں۔ دوقومی نظریہ بھی اسی قسم کی قبائلی باقیات کا نتیجہ ہے۔

امن پسندی کی دو نظریاتی بنیادیں ہیں۔ ایک ہے مبنی بر افادیت امن پسندی۔ مثلاً تجارتی فائدے کے لیے امن پسندی۔ یہ بھی ایک مطلوب امن پسندی ہے۔ لیکن اس کا کوئی اخروی انعام نہیں۔ دوسرا ہے، مبنی بر دعوت امن پسندی۔ یہ مبنی بر اصول امن پسندی ہے، اور اس کا انعام جنت ہے۔ مبنی بر دعوت امن پسندی آخرت کے انعام کے لیے ہوتی ہے، اور اس کا اجر اللہ کے یہاں بہت زیادہ ہے۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے قریش کے ساتھ جو صلح حدیبیہ کی تھی، وہ مبنی بر دعوت امن پسندی تھی، اور یہ امن پسندی پیغمبرانہ اسوہ سے تعلق رکھتی ہے۔ اس نوعیت کی امن پسندی اس اعلیٰ اخلاقِ نبوی سے تعلق رکھتی ہے، جس کے لیے قرآن میں یہ الفاظ آئے ہیں: وَإِنَّكَ لَعَلَى خُلُقٍ عَظِيمٍ (68:4)۔ یعنی اور بیشک تم ایک اعلیٰ اخلاق پر ہو۔

سیلف گلوری

ایک روایت حدیث کی مختلف کتابوں میں الفاظ کے معمولی فرق کے ساتھ آئی ہے۔ مستدرک الحاکم کے الفاظ یہ ہیں: عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ، عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِيمَا يَحْكِي عَنْ رَبِّهِ عَزَّ وَجَلَّ، قَالَ: الْكِبْرِيَاءُ رِدَائِي، فَمَنْ نَازَعَنِي رِدَائِي قَصَمْتُهُ (مستدرک الحاکم، حدیث نمبر 203)۔ یعنی ابو ہریرہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں، آپ اللہ تعالی سے روایت کرتے ہیں کہ بڑائی میری چادر ہے، میری چادر کو جو مجھ سے چھیننے کی کوشش کرے گا، میں اس کو توڑ دوں گا۔

قصم کا لفظی مطلب ہے توڑنا (to destroy)۔ یہ بات اس حدیث میں دنیا کے اعتبار سے ہے۔ یعنی جو آدمی ذاتی بڑائی (self glory) کے نشانے کو لے کر تحریک چلائے گا، وہ کبھی اپنے نشانے کو پورا کرنے میں کامیاب نہ ہوگا۔ خدا اس کی کوششوں اور قربانیوں کو بے نتیجہ بنا دے گا۔

بیسویں صدی اس معاملے کی ایک مثال ہے۔ بیسویں صدی میں مسلم دنیا کے اندر بڑی بڑی شخصیتیں پیدا ہوئیں۔ ان شخصیتوں نے ہمالیائی تحریکیں چلائیں۔ مگر یہ تمام تحریکیں اپنے نشانے کو پانے میں پوری طرح ناکام رہیں۔ ان شخصیتوں کے حالات بتاتے ہیں کہ ان میں سے ہر ایک کا خاتمہ مایوسی (frustration) میں ہوا۔ یہ افراد طوفان کی طرح اٹھے، مگر وہ بلبلے کی طرح ختم ہو گئے۔

غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان شخصیتوں کا مشترک کیس یہ تھا کہ انھوں نے سیاسی نشانہ (political goal) کو اپنا نشانہ بنایا۔ پولیٹکل نشانہ گویا اللہ کی عظمت کو چھیننے کے ہم معنی تھا۔ یہی واحد وجہ ہے کہ غیر معمولی مواقع ملنے کے باوجود یہ افراد اپنے مطلوب نشانے کو پانے میں مکمل طور پر ناکام ہوگیے۔ اہلِ ایمان کے لیے اس دنیا میں صرف ایک ہی صحیح نشانہ ہے، اور وہ دعوت کا نشانہ ہے۔ جو لوگ دعوت الی اللہ کو اپنا نشانہ بنائیں، وہ اللہ کی مدد سے یقینی طور پر کامیاب رہیں گے۔ یہ کامیابی خدائی معیار کے مطابق حاصل ہوگی، نہ کہ کسی انسان کے ذاتی معیار کے مطابق۔

اسلامی نظام

انیسویں صدی کے نصف آخر میں کمیونسٹ نظریہ پھیلا۔ 1917 میں سوویت یونین میں پہلا کمیونسٹ نظام قائم ہوا۔ اب زیادہ منظم انداز میں اسٹیٹ کی سطح پر کمیونسٹ نظریہ کا پروپیگنڈا پوری طاقت سے ہونے لگا۔ اُس زمانہ میں کمیونزم کا نظریہ اتنا زیادہ پھیلا کہ پروفیسر گالبریتھ کے الفاظ میں: دنیا میں کبھی کسی نظریہ کو اتنا زیادہ فروغ حاصل نہیں ہوا جتنا فروغ کمیونزم کے نظریہ کو حاصل ہوا۔

اس فکری ماحول میں جس طرح دوسرے لوگ متاثر ہوئے اسی طرح مسلمانوں کے بہت سے اہل علم بھی متاثر ہو گئے۔ مثلاً مولانا حسرت موہانی، مولانا حفظ الرحمن سیوہاروی، ڈاکٹر محمد اقبال، جمال عبد الناصر، وغیرہ۔ اس ماحول سے متاثر ہو کر مولانا ابوالاعلیٰ مودودی نے اسلام کو نظام کی اصطلاح میں بیان کرنا شروع کیا۔ اُنہوں نے کہا کہ اسلام ایک مکمل اجتماعی نظام ہے اور مسلم ملّت کا یہ فرض ہے کہ وہ اس آئیڈیل انسانی نظام کو دنیا میں قائم کرے۔ ان لوگوں کے نزدیک جہاد کا مقصد یہ تھا کہ وہ انسانی ساخت کے نظاموں کو مغلوب کرے اور ان کی جگہ اسلام کے اعلیٰ نظام کا غلبہ قائم کردے۔

مگر حقیقت یہ ہے کہ یہ تصور کمیونزم کے ردعمل میں پیدا ہوا۔ گویا کہ وہ کمیونزم کا اسلامی ایڈیشن تھا۔ قرآن میں اس کی کوئی بنیاد موجود نہیں۔ حتیٰ کہ پیغمبرِ اسلام اور خلفائے راشدین کے زمانہ میں بھی ایسا کوئی ”معیاری نظام“ موجود نہ تھا۔ اگر دین خداوندی کا مقصد دنیا میں معیاری سماجی نظام بنانا ہو تو یہ نشانہ پوری تاریخ میں کبھی کسی پیغمبر کے زمانہ میں پورا نہیں ہوا۔ گویا نظری اور عملی دونوں اعتبار سے یہ تصور ایک غیر ثابت شدہ تصور ہے اور اسی کے ساتھ نا قابلِ عمل بھی۔

قرآن میں جو احکام دیے گئے ہیں وہ زیادہ تر انفرادی نوعیت کے ہیں۔ نہ صرف ایمان اور عملِ صالح بلکہ دوسرے معاملاتی احکام کی نوعیت بھی یہی ہے۔ مثلاً أَقِيمُوا الدِّينَ (42:13)، لِيَقُومَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ (57:25)، كُونُوا قَوَّامِينَ لِلَّهِ شُهَدَاءَ بِالْقِسْطِ وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَآنُ قَوْمٍ عَلَى أَلَّا تَعْدِلُوا اعْدِلُوا (5:8)، وغیرہ بھی اصلاً انفرادی احکام ہیں، نہ کہ حکومت کے ذریعہ نافذ کیے جانے والے احکام۔

یہ صحیح ہے کہ قرآن میں کچھ ایسے قانونی احکام ہیں جو حکومتی معاملات سے تعلق رکھتے ہیں۔ مثلاً چوری، زنا، شراب خوری، قذَف، قتل، وغیرہ۔ مگر اس قسم کے احکام بہت کم ہیں۔ ان احکام کو وضع کرنے کا مقصد ''معیاری سماج'' بنانا نہیں ہے بلکہ ان کا اصل مقصد یہ ہے کہ سماج میں ضروری نظم برقرار رہے:

It is just to maintain a necessary level of order in society.

اس نقطۂ نظر کا ایک ثبوت یہ ہے کہ معیاری سماج بنانے کے لیے جو نظام مطلوب ہے اس کے کئی انتہائی اہم اجزاء کے بارے میں اسلام میں کوئی واضح حکم موجود نہیں۔ مثال کے طور پر یہ کہ خلیفہ (حاکم) کا تقرر کس طرح کیا جائے — پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد، عمر بن عبد العزیز کو شامل کرتے ہوئے پانچ ایسے صدر ریاست ہوئے ہیں جن کو متفقہ طور پر خلیفۂ راشد کہا جاتا ہے۔ مگر ان پانچوں کے لیے تقرر کا طریقہ الگ الگ اختیار کیا گیا۔ اسی طرح شوریٰ کے بارہ میں کوئی متعین نظام یا ڈھانچہ اسلام کے دور اول میں موجود نہیں جو نمونہ کی حیثیت رکھتا ہو۔

موجودہ دنیا امتحان کے لیے بنائی گئی ہے۔ یہاں ہمیشہ ہر ایک کے لیے ناموافق حالات موجود رہیں گے، تاکہ امتحان کے تقاضے کو پورا کیا جاسکے۔ خدائی تخلیق کے مطابق، معیاری دنیا موت کے بعد صرف جنت میں بنے گی۔ موجودہ دنیا میں انسان کا کام یہ ہے کہ وہ اپنے آپ کو اس قابل بنائے کہ اس کو اگلے دورِ حیات میں بننے والی معیاری دنیا (جنت) میں داخلہ مل سکے۔ موجودہ دنیا میں معیاری سماجی نظام بنانے کی کوشش کرنا گویا جنت کو موجودہ دنیا ہی میں تعمیر کرنا ہے جو خدائی نقشہ کے مطابق، سرے سے ممکن ہی نہیں۔ خود پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے ہجرت کے بعد مدینہ میں اس کے سابقہ نظام کو علیٰ حالہٖ فتح مکہ تک باقی رکھا۔

سماجی نظام کے بارے میں اسلام کا تصور یہ ہے کہ اگر ایسا نظام عملاً موجود ہو جو اہلِ ایمان کے لیے کوئی مسئلہ پیدا نہ کرے تو اُس سے ٹکراؤ نہیں کیا جائے گا۔ اُس کو عملاً تسلیم کرتے ہوئے اُس کے تحت افراد اور ادارے کی سطح پر اسلام کی پیروی جاری رکھی جائے گی۔ یہی وجہ ہے جس کی

بنا پر حضرت یوسف نے اپنے وقت کے مشرک بادشاہ سے ٹکراؤ نہیں کیا۔ کیوں کہ وہ ایک عادل بادشاہ تھا اور اس کے تحت پیغمبر یوسف توحید کے تقاضے پورے کرتے ہوئے رہ سکتے تھے۔ اسی طرح پیغمبر اسلام کے اصحاب مکی دور کے آخر میں مکہ سے ہجرت کرکے حبش گئے۔ اس وقت وہاں ایک عیسائی بادشاہ کی حکومت تھی۔ اصحابِ رسول نے اس سے ٹکراؤ نہیں کیا۔ کیوں کہ وہ ایک عادل بادشاہ تھا اور اس نے لوگوں کو مذہبی آزادی دے رکھی تھی۔

یہ تصور کہ اسلام ایک معیاری سماجی نظام ہے اور اس کو دنیا میں عملاً قائم کرنا امتِ مسلمہ پر فرض ہے، یہ نظریہ اسلام کے اصل مقصد کے خلاف ہے، وہ اسلام کے نشانہ کو بدل دینے والا ہے۔ اسلام کا اصل نشانہ یہ ہے کہ ہر فرد خدا کی معرفت حاصل کرے۔ ہر فرد عبادت اور اخلاقیات میں ربّانی بنے۔ ہر فرد فلاحِ آخرت کو اپنا ہدف بنائے۔ مگر مذکورہ نظریہ آخرت کے بجائے دنیا کو آدمی کا نشانہ بنا دیتا ہے۔ وہ تعمیرِ آخرت کے بجائے تعمیرِ دنیا کو اپنی منزل مقصود سمجھ لیتا ہے۔ اسلام ایک ربّانی مذہب ہے۔ مگر مذکورہ تصور اسلام کو ایک مادّی اور سیاسی مذہب میں تبدیل کر دیتا ہے۔

اسلام کا اصل مقصد یہ ہے کہ آدمی خدا کو دریافت کرے۔ وہ اپنے اندر ربانی شخصیت کی تعمیر کرے (آل عمران، 3:79)۔ وہ اپنے روزمرہ کے واقعات میں حقیقتِ اعلیٰ کی جھلکیاں دیکھنے لگے۔ وہ دنیا کی زندگی کو فتنہ (آزمائش) اور آخرت کی زندگی کو اصل مطلوب سمجھنے لگے۔ جو آدمی اس قسم کا ذہن رکھتا ہو اس کے لیے موجودہ دنیا میں معیاری قسم کا سماجی اور سیاسی نظام بنانا ایسا ہی ہے جیسے کہ ٹرین کا کوئی مسافر کسی پلیٹ فارم پر اپنی پسند کا گھر بنانے لگے۔

قرآن میں جنت کا تذکرہ کرتے ہوئے کہا گیا ہے: لِمِثْلِ هَذَا فَلْيَعْمَلِ الْعَامِلُونَ (37:61)۔ یعنی ایسی ہی کامیابی کے لیے عمل کرنے والوں کو عمل کرنا چاہیے۔ اسی طرح حدیث میں آیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا: اللَّهُمَّ لاَ عَيْشَ إِلَّا عَيْشُ الآخِرَةْ (صحیح البخاری، حدیث نمبر 2961)۔ یعنی اے اللہ، زندگی تو آخرت کی زندگی ہے۔

اس طرح کی تعلیمات قرآن و حدیث میں کثرت سے آئی ہیں۔ ان تعلیمات سے ایک شخص

کے اندر جو ذہن بنتا ہے، وہ مذکورہ نظامی تصور سے مطابقت نہیں رکھتا۔ یہ کہنا صحیح ہوگا کہ مذکورہ قسم کا نقطۂ نظر آدمی کو ایک قسم کا ''اسلامی کمیونسٹ'' بناتا ہے۔ وہ حقیقی معنوں میں اسلامی شخصیت کی تعمیر نہیں کرتا۔

اس فرق کو بتانے کے لیے ربانی اسلام اور سیاسی اسلام کا لفظ استعمال کیا جاسکتا ہے۔ ربانی اسلام آدمی کے اندر معرفتِ خداوندی کا ذہن بناتا ہے۔ وہ آدمی کے اندر احتسابِ خویش کا جذبہ پیدا کرتا ہے۔ وہ جنت کے تصور میں جینے لگتا ہے۔ اُس کے صبح وشام آخرت کی یادوں میں بَسر ہونے لگتے ہیں۔ وہ دنیا کی کامیابی کو غیر اہم اور آخرت کی کامیابی کو اہم سمجھنے لگتا ہے۔ وہ دنیا کو صرف بقدر ضرورت لینا چاہتا ہے اور آخرت کو بقدرِ شوق۔ اُس کی نظر میں دنیا کی کامیابی غیر اہم بن جاتی ہے اور آخرت کی کامیابی اہم۔

اس کے برعکس ذہن وہ ہے، جو سیاسی اسلام کے نظریہ کے تحت تیار ہوتا ہے۔ ایسے آدمی کی سوچ سیاسی سوچ ہوتی ہے۔ سیاسی اور حکومتی چیزیں اس کی توجہ کا مرکز بن جاتی ہیں۔ سیاسی نوعیت کی چیزیں شعوری یا غیر شعوری طور پر اس کے لیے اولین بن جاتی ہیں اور ربانی نوعیت کی چیزیں عملاً ثانوی حیثیت اختیار کرلیتی ہیں۔ عبادت کے معاملہ میں وہ صرف اس کے ظاہری فارم پر قناعت کرلیتا ہے۔ اس کے اخلاق سیاسی مصلحتوں کے تابع ہوجاتے ہیں۔ تقویٰ اور خشیت اور اخبات اور تضرع جیسی چیزیں اس کے مزاج کے اعتبار سے اجنبی چیزیں بن جاتی ہیں۔ ایسے لوگوں کی مجلس میں اگر آپ بیٹھیں تو آپ کو زیادہ تر سیاسی باتیں سننے کو ملیں گی، نہ کہ ربّانیت اور للّٰہیت کی باتیں۔

اسلام کا اصل مقصد فرد بنانا ہے، نہ کہ سماجی اور حکومتی نظام بنانا۔ جس سماج میں افراد قابل لحاظ تعداد میں تیار ہوجائیں، وہاں یقینا سماجی سطح پر بھی اس کا ظہور ہوگا۔ مگر جہاں تک دعوتی نشانہ کا تعلق ہے، اسلام کا اصل نشانہ تعمیرِ افراد ہے، نہ کہ سماجی اور حکومتی ڈھانچہ بنانا۔

اسلام کے فکری مطالعہ میں اس کو بطورِ اصول ماننا ضروری ہے۔ اگر اس کو نہ مانا جائے تو کہنے والا یہ کہہ سکتا ہے کہ کسی بھی پیغمبر نے مکمل نظام کے احکام نہیں بتائے اور نہ کسی بھی پیغمبر نے عملی

طور پر اس کا کوئی نمونہ پیش کیا۔ حقیقت یہ ہے کہ اس اصول کو ملحوظ نہ رکھنے کی صورت میں تمام پیغمبروں کی تحریک، نعوذ باللہ، فکری اور عملی دونوں اعتبار سے ناقص اور ناتمام نظر آتی ہے۔

قرآن کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ پیغمبروں کی تحریک کا اصل مقصد یہ تھا کہ ایسے اعلیٰ افراد کو تیار کیا جائے جو آخرت کی ابدی جنت میں بسائے جانے کے قابل ہوں۔ پیغمبروں کی تحریک کا مقصد یہ نہیں تھا کہ آج ہی لوگوں کے لیے ایک ایسی دنیا بنائی جائے جہاں وہ آخرت اور یوم الحساب سے پہلے ہی اپنے رہنے کے لیے ایک جنت کو حاصل کرسکیں۔

میل ملاپ کا سماج

کلدیپ نائر (Kuldip Nayar) 1923 میں سیالکوٹ (پاکستان) میں پیدا ہوئے، اور 2018 میں انڈیا میں ان کی وفات ہوئی۔ تقسیم کے بعد وہ انڈیا آ گئے۔ یہاں انھوں نے انگلش جرنلزم میں نمایاں پوزیشن حاصل کی۔ اپنے ابتدائی زمانے میں وہ اردو زبان میں لکھا کرتے تھے۔ انڈیا آنے کے بعد وہ دہلی کے ایک اردو اخبار (وحدت) میں کام کرنے لگے۔ اس زمانے میں ان کی ملاقات حسرت موہانی سے ہوئی، جو کہ اردو کے شاعر تھے۔ انھوں نے کلدیپ نائر میں انگلش کی صلاحیت محسوس کی۔ چنانچہ انھوں نے مشورہ دیا کہ وہ اردو صحافت کو چھوڑ کر انگلش صحافت میں اپنا کیریر بنائیں۔ کلدیپ نائر نے حسرت موہانی کے مشورے کو مان لیا، اور پھر انگلش اخباروں میں لکھنا شروع کیا، یہاں تک کہ ترقی کرتے ہوئے انگلش کے ممتاز صحافی بن گئے، اور ترقی کرتے کرتے انڈیا میں کئی اعلیٰ مناصب حاصل کیا۔ کلدیپ نائر کے تعلقات ہندو مسلم دونوں سے بہت اچھے تھے۔

تقسیم (1947) سے پہلے برصغیر ہند میں میل ملاپ کا سماج تھا۔ ہندوؤں کو مسلمانوں سے فائدہ پہنچتا تھا، اور مسلمانوں کو ہندوؤں سے فائدہ ملتا تھا۔ اس طرح دونوں کے درمیان اچھے تعلقات قائم تھے۔ اچھے تعلقات کے نتیجے میں دونوں کو ایک دوسرے سے فائدہ پہنچتا تھا، اور دونوں ترقی کر رہے تھے۔ تقسیم کے بعد دونوں فرقوں کے درمیان تعلقات خراب ہو گئے۔ اب مصلحین نے یہ کوشش کی کہ اجلاس اور سیمیناروں کے ذریعے دونوں کے درمیان دوبارہ بہتر تعلقات قائم کیے جائیں۔ مگر اس کوشش میں کوئی قابلِ ذکر کامیابی حاصل نہیں ہوئی۔ اس کا سبب یہ ہے کہ بہتر سماجی تعلقات فطری طور پر قائم ہوتے ہیں۔ وہ جلسہ اور سمینار کے ذریعے قائم نہیں ہوتے۔ ملک کی تقسیم سے پہلے دونوں کے درمیان فطری عمل کے ذریعے اچھے تعلقات قائم تھے۔ مگر تقسیم کے بعد جب یہ فطرت پر مبنی تعلقات ٹوٹ گئے، تو وہ دوبارہ پہلے کی طرح قائم نہ ہو سکے۔ حقیقت یہ ہے کہ بہتر سماجی تعلقات فطری عمل کے ذریعے بنتے ہیں، نہ کہ مصنوعی تدبیروں کے ذریعے۔

ایک سنگین برائی

ایک حدیثِ رسول ان الفاظ میں آئی ہے: إِيَّاكُمْ وَالشُّحَّ، فَإِنَّهُ دَعَا مَنْ قَبْلَكُمْ فَاسْتَحَلُّوا مَحَارِمَهُمْ، وَسَفَكُوا دِمَاءَهُمْ، وَقَطَّعُوا أَرْحَامَهُمْ (مسند احمد، حدیث نمبر 9569)۔ یعنی تم اپنے آپ کو حرص سے بچاؤ، کیوں کہ حرص نے تم سے پہلے لوگوں کو ابھارا تو انھوں نے اپنی حرام چیزوں کو حلال کرلیا، اور آپس میں خون ریزی کی، اور آپس میں قطع رحمی کی۔

شح کا مطلب ہے حرص (greed)، یعنی زیادہ چاہنا۔ حرص کا مزاج انسان کے لیے اتنا زیادہ نقصان دہ کیوں ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ انسان کے اوپر حرص کا جب غلبہ ہوتا ہے، تو وہ اس کی سوچ کو حرص والی سوچ بنا دیتا ہے۔ وہ اپنی ضرورت سے زیادہ کا خواہش مند ہوتا ہے۔ زیادہ چاہنے کا یہ مزاج آدمی کے اندر اور کئی برائیاں پیدا کرتا ہے۔ مثلاً وہ انسان کو اپنا دوست سمجھنے کے بجائے، انسان کو اپنا حریف سمجھنے لگتا ہے۔ وہ دوسروں کو دینے کے بجائے، دوسروں سے لینے کا خواہش مند بن جاتا ہے۔ اس کی سوچ انسان رخی سوچ کے بجائے خود رخی بن جاتی ہے۔ ایسا انسان ایک خود غرض انسان بن جاتا ہے۔

حرص کا مزاج آدمی کے اندر تنگ دلی کی نفسیات پیدا کرتا ہے۔ ایسا آدمی کشادہ دلی کی اعلیٰ نفسیات سے محروم ہوجاتا ہے۔ وہ ہر معاملے میں اپنی ذات کو لے کر سوچتا ہے۔ انسانیت عامہ کو لے کر سوچنے کا مزاج اس کے اندر پرورش نہیں پاتا ہے۔ ایسا آدمی اس فطری حقیقت سے بے خبر ہوجاتا ہے کہ اس دنیا میں دینے والے کو ملتا ہے، جو آدمی دوسروں کو دینا نہ جانے، اس کو دوسروں کی طرف سے ملنے والا بھی نہیں۔ ایسا آدمی کوئی بڑا منصوبہ نہیں بنا سکتا۔ بڑا منصوبہ بنانے کے لیے بڑا دل درکار ہوتا ہے، اور حرص کے مزاج کی بنا پر بڑا دل پہلے ہی اس سے رخصت ہوجاتا ہے۔ حرص بظاہر ایک اخلاقی برائی ہے، لیکن اپنے نتیجے کے اعتبار سے وہ انسان کی پوری شخصیت پر چھا جاتی ہے۔ حریص انسان بظاہر انسان ہوتا ہے، لیکن اپنی حقیقت کے اعتبار سے وہ مثلِ حیوان بن جاتا ہے۔

بڑھاپے کا دور

زندگی میں آدمی کے لیے بہت سے مسئلے آتے ہیں۔ مثلاً بیماری، حادثہ، نقصان، وغیرہ۔ لیکن بڑھاپا ایک بالکل مختلف قسم کا مسئلہ ہے۔ بڑھاپا گویا خاتمۂ حیات کا نام ہے۔ بڑھاپا ہمیشہ پائنٹ آف نو ریٹرن (point of no return) پر آتا ہے۔ بڑھاپا ہر اعتبار سے انسان کے لیے صرف ایک مسئلہ ہے۔

لیکن بڑھاپے کا ایک مثبت پہلو ہے، جو صرف بڑھاپے سے حاصل ہوتا ہے، اور وہ عجز (helplessness) کی دریافت ہے۔ عجز کی دریافت دوسرے اسباب سے بھی جزئی طور پر ہوتی رہتی ہے، لیکن کامل معنوں میں عجز کی دریافت صرف بڑھاپے سے حاصل ہوتی ہے۔ کیوں کہ بڑھاپا کسی آدمی کو اس وقت آتا ہے، جب کہ اس کا جسم ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو جائے۔

انسان کا جسم فطری طور پر ایک بہترین ساخت پر قائم ہے۔ اس جسم کو تقریباً 80 آرگن (organs) نہایت اعلی مینجمنٹ کے ساتھ چلا رہے ہیں۔ عمر کے بڑھنے کے ساتھ یہ آرگن جزئی یا کلی طور پر اپنا فنکشن بند کر دیتے ہیں۔ اس فنکشن کو دوبارہ جاری نہیں کیا جا سکتا۔ کسی آرگن کے فیل ہونے کا آخری نتیجہ موت ہوتا ہے۔

عجز بلاشبہ حقیقتِ اعلی کی دریافت ہے۔ حقیقتِ اعلی کی دریافت کے بغیر انسان کی شخصیت ایک ناقص شخصیت ہوتی ہے۔ ناقص شخصیت کا مکمل ہونا، صرف اس وقت ہوتا ہے، جب کہ انسان بڑھاپے کی عمر کو پہنچ جائے۔ بڑھاپے کا دور سب سے بڑی دریافت کا دور ہے۔ لیکن عملاً یہ ہوتا ہے کہ بوڑھا انسان مسلسل طور پر صرف شکایت (complaint) میں جیتا ہے۔ کم از کم میں نے کسی بوڑھے انسان کو نہیں پایا، جو بڑھاپے کی عمر کو پہنچنے کے باوجود شکایت کی نفسیات سے بچا ہوا ہو۔

اگر غور سے دیکھا جائے تو اکثر حالت میں ایسا ہوتا ہے کہ مادی اعتبار سے انسان کا جسم اگرچہ بوڑھا ہوتا ہے لیکن اس کا ذہن بدستور کام کرتا رہتا ہے۔ مزید یہ کہ اس کا ذہن پہلے سے بہتر ہو جاتا

ہے۔ کیوں کہ اس کے ذہن میں تجربات کا اضافہ ہوجاتا ہے۔ انسان اس قابل ہوجاتا ہے کہ وہ زیادہ گہرے انداز میں معاملات پر رائے قائم کرسکے۔ پہلے اگر وہ صرف جاننے والا تھا، اب وہ ایک دانش مند انسان بن جاتا ہے۔ وہ اس قابل ہوجاتا ہے کہ وہ زیادہ بصیرت افروز انداز میں معاملات پر اپنی رائے دے سکے۔ وہ لوگوں کو زیادہ صائب (rational) انداز میں درست مشورہ دے سکے۔ بوڑھا انسان ایک پختہ (mature) انسان ہوتا ہے۔ وہ اپنے تجربات کی بنا پر اس قابل ہوتا ہے کہ وہ لوگوں کو زیادہ نتیجہ خیز رہنمائی دے سکے۔

انسان کی سب سے بڑی دریافت یہ ہے کہ وہ اپنے خالق (Creator) کو ڈسکور کرے۔ یہ دریافت (discovery) ہر لمحے ہوسکتی ہے۔لیکن عملاً یہ ہوتا ہے کہ آدمی بڑھاپے سے پہلے بُھلاوہ کلچر میں جیتا ہے۔ وہ بھلاوہ کلچر سے صرف اس وقت باہر نکلتا ہے، جب کہ وہ بڑھاپے کی عمر کو پہنچے۔ جب اس کے آرگن کام کرنا بند کرنے لگیں۔ یہی اصل عجز کی دریافت کا وقت ہوتا ہے، اور یہی وہ وقت ہوتا ہے، جب کہ انسان شعوری طور پر قادر مطلق خدا کو دریافت کرے،لیکن انسان اپنی بے خبری کی بنا پر یہ کرتا ہے کہ اپنی زندگی کے پہلے دور میں وہ بے خبری (unawareness) میں جیتا ہے، اور دوسرے دور میں شکایت کی نفسیات میں۔ اس طرح انسان اپنی طاقت کے دَور کو بھی کھودیتا ہے، اور اپنے ضعف کے دَور کو بھی۔

بڑھاپے کی عمر پختگی (maturity) کی عمر ہوتی ہے۔ اس زمانے میں انسان کا تجربہ (experience) بڑھ جاتا ہے۔ انسان اس قابل ہوتا ہے کہ وہ زیادہ معلومات کی روشنی میں غوروفکر کرے۔ یہ چیزیں انسان کی عقل میں اضافہ کرتی ہیں۔ انسان اس قابل ہوجاتا ہے کہ وہ لوگوں کو زیادہ دانش مندانہ رائے دے سکے۔ عمر رسیدہ آدمی سماج میں اس قابل ہوتا ہے کہ وہ زیادہ دینے والا (giver) بن کر رہ سکے۔ بوڑھا آدمی اگر صرف ایک کام کرے کہ وہ ایک ایسی کتاب لکھے، جس میں اس نے اپنی زندگی کے تجربات بیان کیے ہوں، تو ہر آدمی اپنی سوسائٹی کا ایک عظیم دینے والا (great giver) بن کر دنیا سے رخصت ہوگا۔

پختگی کیا ہے

پختگی (maturity) یہ ہے کہ آدمی اپنے غصہ پر قابو پالے اور اختلافات کو تشدد اور تخریب کے بغیر دور کر سکے۔ پختگی تحمل اور برداشت کا نام ہے اور اس صلاحیت کا کہ وقتی خوشی کو دیر طلب مقاصد کے لیے قربان کر دیا جائے۔ پختگی اس استعداد کا نام ہے کہ کسی تلخی کے بغیر، ناخوش گوار اور مایوس کن حالات کا مقابلہ کیا جائے۔ پختگی انکساری کا نام ہے۔ ایک پختہ شخص یہ کہنے کا حوصلہ رکھتا ہے کہ ''میں غلطی پر تھا''۔ پختگی اس صلاحیت کا نام ہے کہ آدمی ان چیزوں کے ساتھ پُر امن طور پر رہ سکے جن کو وہ بدل نہیں سکتا۔

Maturity is the ability to control anger, and settle differences without violence or destruction. Maturity is patience, the willingness to give up immediate pleasure in favour of the long-term gain. Maturity is the capacity to face unpleasantness and disappointment without becoming bitter. Maturity is humility. A mature person is able to say, “I was wrong”. Maturity is the ability to live in peace with things we cannot change.

پختگی دراصل حقیقت واقعہ کے اعتراف کا دوسرا نام ہے۔ وہ ساری صفتیں جن کو پختگی کہا جاتا ہے، وہ سب حقیقت واقعہ کے اعتراف سے پیدا ہوتی ہیں۔ حقیقت واقعہ کے اعتراف کا مطلب یہ ہے کہ آدمی اس بات کو جانے کہ کہاں اس کی حد ختم ہوتی ہے اور کہاں سے دوسری طاقتوں کی حد شروع ہوجاتی ہے۔ وہ کیا چیز ہے جو فطرت کے قانون کے مطابق، اُس کے لیے ممکن ہے۔ اور وہ کیا چیز ہے جو فطرت کے قانون کے مطابق، اس کے لیے ممکن نہیں۔ حقیقتِ واقعہ کا اعتراف آدمی کو اس قابل بناتا ہے کہ وہ اقدام سے پہلے اُس کے انجام کو سوچے، وہ اپنے عمل کی نتیجہ خیز منصوبہ بندی کرے۔

صحیح طرزِ فکر

صحیح طرزِ فکر (right thinking) حکیمانہ طرزِ فکر کی ایک اعلیٰ قسم ہے۔ اصل یہ ہے کہ ہم جس دنیا میں جیتے ہیں، یا صبح وشام گزارتے ہیں، اس میں چیزیں الگ الگ نہیں ہیں، بلکہ مخلوط (mixed) حالت میں ہیں۔ اس بنا پر بظاہر چیزوں کے بارے میں صحیح رائے قائم کرنا مشکل ہوجاتا ہے۔ چیزوں کے بارے میں صحیح رائے اس وقت قائم ہوتی ہے، جب کہ آپ چیزوں کو الگ الگ کرکے دیکھ سکیں۔ اس تجزیاتی مطالعے کے بغیر آدمی کے اندر صحتِ فکر پیدا نہیں ہوسکتی، وہ مبنی بر واقعہ سوچ کا حامل نہیں بن سکتا۔

مثلاً ایک شخص اپنے بارے میں یا اپنی کمیونٹی کے بارے میں یہی کہے گا کہ ہمارے اوپر ظلم ہورہا ہے۔ اگر اس سے یہ کہا جائے کہ تمھارے باپ دادا کا جو اسٹینڈرڈ تھا، کیا تمھارا اسٹینڈرڈ اس سے کم ہے۔ وہ جواب دے گا کہ نہیں اس سے تو بہت اچھا ہے۔ مثلاً میرے باپ دادا بائیسکل پر سفر کرتے تھے، آج میں کار پر سفر کرتا ہوں۔ میرے دادا کے زمانے میں بچے معمولی مدرسے میں پڑھتے تھے، آج وہ شہر کے ایک اچھے انگریزی اسکول میں پڑھ رہے ہیں۔ میرے دادا کچے گھر میں رہتے تھے، آج میں اور میرے بچے پکے گھر میں رہ رہے ہیں، وغیرہ۔ اب اگر آپ اس سے پوچھیں کہ جب تمھاری فیملی کا اسٹینڈرڈ پہلے کے مقابلے میں بہت زیادہ بہتر ہے، تو ظلم کہاں ہورہا ہے۔ اب وہ حیران ہوجائے گا، اور کہے گا کہ میں نے اس اعتبار سے کبھی نہیں سوچا۔

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اصل مسئلہ کہاں ہے۔ اصل مسئلہ خارج میں نہیں ہے، بلکہ داخل میں ہے۔ لوگوں کے اندر صحیح طرزِ فکر نہیں ہے۔ اس لیے لوگ شکایت میں جی رہے ہیں، حالاں کہ انھیں شکر میں جینا چاہیے۔ صحیح طرزِ فکر تجزیاتی فکر کا نام ہے۔ اگر آپ کے اندر ڈی ٹیچڈ تھنکنگ (detached thinking) ہو، اگر آپ تجزیاتی انداز میں سوچنا جانتے ہوں، تو آپ درست طرزِ فکر کے حامل بن سکتے ہیں۔

ہار کے بعد جیت

زندگی میں ہار بھی ہے، اور جیت بھی۔ شکست کا تجربہ بھی ہے، اور فتح کا تجربہ بھی۔ جو آدمی ہر صورتِ حال کو قبول کرنے کے لیے تیار ہو، اس کے لیے کوئی ہار ہار نہیں، کوئی شکست شکست نہیں۔ ایسے آدمی کے لیے ہار بھی جیت ہے، اور شکست بھی فتح۔ ایسے آدمی کے لیے وقتی طور پر بظاہر نا اُمیدی کے حالات پیدا ہو سکتے ہیں، لیکن مستقل طور پر امید کے حالات کا آنا اس کے لیے کبھی بند ہونے والا نہیں۔ شکست کو نہ ماننا، آدمی کے اندر منفی (negative) سوچ پیدا کرتا ہے۔ اس کے برعکس، شکست کو مان لینا، آدمی کے اندر نئی ہمت پیدا کرتا ہے۔ شکست کو مان لینا اپنے نتیجے کے اعتبار سے یہ ہے کہ ایک آدمی نے اپنے آپ کو اس کے لیے تیار کیا کہ وہ ایک موقع کو کھونے کے بعد دوسرے موقعے کی تلاش کرے، وہ دوسرے موقعے کو اویل کرکے اپنی ہار کو جیت بنالے۔

زندگی میں کبھی حالات یکساں نہیں ہوتے۔ ہر آدمی کے ساتھ ایسا ہوتا ہے کہ اس کے ساتھ ہر قسم کی صورتِ حال پیش آتی ہے، کبھی ایک صورتِ حال اور کبھی دوسری صورتِ حال۔ آدمی اگر ہمت نہ ہارے تو وہ ایک موقع کو کھو کر دوسرے موقع کو اویل کرے گا۔ وہ ایک ہار کے بعد دوبارہ نئی ہمت کے ساتھ جیت حاصل کرنے کی کوشش کرے گا۔ آدمی کو چاہیے کہ وہ کبھی ہمت نہ ہارے، وہ ہمیشہ یہ یقین رکھے کہ ہر شام کے بعد دوبارہ صبح کا سورج نکلتا ہے۔ ہر نقصان کے بعد دوبارہ پانے کے راستے کھلتے ہیں۔ زندگی کی کتاب کا ایک چیپٹر بند ہوتا ہے، تو فطرت کے قانون کے مطابق، دوسرا چیپٹر کھل جاتا ہے۔

یاد رکھیے، ایک انسان اپنی کوشش میں ہار سکتا ہے، لیکن جو دینے والا ہے، اس کو کبھی ہار نہیں پیش آتی۔ انسان اگر اپنی کھڑکیاں بند کرلے، تب بھی ہوا کے جھونکے اس کی کھڑکیوں سے ٹکراتے رہیں گے، انسان اگر اپنا دروازہ بند کرلے، تب بھی سورج کی روشنی اس کا انتظار کرتی ہے کہ انسان کب اپنا دروازہ کھولے، اور وہ اس کے کمرے میں داخل ہوجائے۔

خواتین کومشغولیت دیجیے

ایک خاتون کے اندر شکایتی مزاج تھا، اور ان کی فیملی لائف بھی جھگڑے کی وجہ سے درست نہیں تھی۔ اس کے بعد یہ ہوا کہ حالات کی وجہ سے اس کو ایک جاب مل گیا، اور وہ اس میں مشغول ہوگئیں۔ اب معاملہ یہ ہوا کہ وہ گھر میں خوش رہنے لگیں، اور ان کی فیملی لائف بھی درست راستے پر چلنے لگی۔ اسی طرح ایک اور خاتون کے بارے میں یہ معلوم ہوا کہ وہ جب گھر میں خالی تھیں، تو ان کی گھریلو زندگی بھی ٹھیک نہیں تھی۔ اس کے بعد یہ ہوا کہ انھوں نے اسکول میں ٹیچر کی جاب حاصل کرلی، پھر انھوں نے اپنی کمائی سے اپنے شوہر کو عمرہ کروایا۔ اب ان دونوں خواتین کی زندگی ایک باحوصلہ خاتون کی زندگی بن گئی ہے۔ بجائے شکایتی باتوں کے اب وہ تعمیری باتیں کرنا زیادہ پسند کرتی ہیں۔

عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ تربیت کا طریقہ یہ ہے کہ بیٹھ کر سمجھایا جائے۔ تربیت کا زیادہ بہتر طریقہ یہ ہے کہ خواتین کو مشغولیت دی جائے، ان کو مشغول رہنے کا فن سکھایا جائے۔ خاص طور پر ایسی مشغولیت جو ان کے لیے مزید آمدنی کا ذریعہ بن جائے۔ مثلاً دونوں خواتین اپنے گھروں میں جب تک خالی تھیں، ان کا گھریلو معاملہ درست نہیں تھا، لیکن جب ان کو جاب کی شکل میں ایک مشغولیت مل گئی، تو ان کی گھریلو زندگی درست ہوگئی۔ مشغولیت اپنے آپ میں تربیت کا ذریعہ ہے۔ مشغولیت آدمی کے اندر تعمیری ذہن پیدا کرتی ہے۔ مشغولیت آدمی کے اندر یہ احساس پیدا کرتی ہے کہ وہ اپنے خاندان میں اپنے سماج کا ایک مفید حصہ ہے۔ مشغولیت آدمی کو اپنے سماج کا دینے والا ممبر (giver member) بناتی ہے۔ مشغولیت آدمی کو یہ احساس دیتی ہے کہ دوسرے بہت سے انسانوں کی طرح وہ بھی سماج کا مفید عنصر بن سکتا ہے۔ مشغولیت کے مزید بہت سے فائدے ہیں۔ مثلاً مشغولیت انٹرایکشن میں اضافہ کرتی ہے۔ مشغولیت آدمی کی تخلیقیت (creativity) بڑھاتی ہے۔ مشغولیت آدمی کے اندر وسعتِ نظری (broadmindedness) پیدا کرتی ہے۔ مشغولیت آدمی کی عزتِ نفس میں اضافہ کرتی ہے۔ مشغولیت آدمی کے احساسِ شکر میں اضافہ کرتی ہے۔

جاپانی قوم کی ترقی کا راز

ایک میگزین میں جاپانی قوم کی ترقی پر ایک مضمون چھپا تھا۔ اس مضمون کے مطابق، جاپان کی ترقی کے راز دس ہیں۔ وہ دس راز یہ ہیں: (1) سب سے زیادہ کام کرنے والی قوم (2) احساس ذمہ داری (3) کفایت شعاری (4) ان کے یہاں وفاداری کو انتہائی اہمیت حاصل ہے (5) نئی نئی ایجادات، اور ایجاد شدہ چیزوں میں جدت کی ہمہ وقت کوشش کرنا (6) ہمت نہیں ہارنا (7) مطالعہ کا شوق (8) ٹیم بنا کر کام کرنا (9) بچپن ہی سے اپنے پیروں پر کھڑا ہونا سکھانا (10) ترقی اور ٹکنالوجی کے باوجود اپنے کلچر وثقافت سے جڑے رہنا۔

جاپان کی ترقی کے لیے یہ دس صفات اصل نہیں ہیں۔ اصل صفت صرف ایک ہے، اور بقیہ صفتیں اس اصل کے نتیجہ کے طور پر پیدا ہوئی ہیں۔ جاپان کی ترقی کا اصل سبب وہ ہے جس کو جاپان کے بادشاہ نے ان الفاظ میں بیان کیا تھا: "ہمیں ناقابل برداشت کو برداشت کرنا ہے، تا کہ ہم نیا جاپان وجود میں لاسکیں۔" حقیقت یہ ہے کہ زندگی میں ہمیشہ کچھ مسائل ہوتے ہیں۔ عام لوگ یہ کرتے ہیں کہ وہ مسائل کو حل کرنے میں الجھ جاتے ہیں، اور پھر یہ ہوتا ہے کہ اپنا سب کچھ خرچ کرنے کے باوجود نہ مسائل حل ہوتے ہیں، اور نہ مطلوب حاصل ہوتا ہے۔ اس کے برعکس، دوسری عالمی جنگ کے بعد جاپان کے سامنے بہت بڑے بڑے مسائل تھے۔ لیکن جاپان نے مسائل کو مکمل طور پر نظر انداز کیا، اور اپنی ساری توجہ مواقع کو اویل (avail) کرنے میں لگا دیا۔ اسی دانش مندانہ اصول کو اختیار کرنے کا نتیجہ تھا کہ جاپان 25 سال کے بعد ایک نئی عالمی طاقت بن کر ابھر آیا۔

مذکورہ مضمون میں جاپان کے بارے میں جن دس صفات کا ذکر کیا گیا ہے، یہ یا ایسی دس اور صفات ہمیشہ بطور نتیجہ پیدا ہوتی ہیں۔ جب انسان صحیح نقطۂ آغاز (starting point) کو دریافت کرلے، اور اپنی پوری توجہ اسی ایک نشانے کے حصول پر لگا دے تو اس کی ذہنی صلاحیتیں، ایک صحیح رخ پر بیدار ہو جاتی ہیں۔ اس کے بعد آدمی کے اندر دوسری تمام خصوصیات اپنے آپ پیدا ہو جاتی ہیں۔

خبر نامہ اسلامی مرکز — 268

• ڈاکٹر ریکو اوکاوا (Dr. Reiko Okawa) اسلامک اسٹڈیز، یونیورسٹی آف جاپان میں پروفیسر ہیں۔ وہ امن کے تعلق سے قرآن کی تفسیر پر ریسرچ کر رہی ہیں۔ چنانچہ انھوں نے 29 دسمبر 2018 کو صدر اسلامی مرکز سے ملاقات کی، اور کافی دیر تک انٹریکشن کیا، جس میں اسلام، مسلمان اور حالاتِ حاضرہ پر گفتگو ہوئی۔ صدر اسلامی مرکز نے ان کو بتایا کہ اسلام کی تمام تعلیمات امن، بھائی چارہ اور صلحِ کل پر مبنی ہیں۔ اسلام کو اس کے اوریجنل سورس سے سمجھنے کی ضرورت ہے، نہ کہ مسلمانوں کے عمل سے۔ آخر میں ان کو انگریزی ترجمۂ قرآن اور دوسرے اسلامی لٹریچر بطور تحفہ دیے گئے۔

• 4 جنوری 2019 کو جرمنی سے کرسچن مشنری کا ایک وفد صدر اسلامی مرکز سے ملاقات کے لیے آیا۔ اس گروپ کی آمد کا مقصد اسلامی تعلیمات سے آگاہ ہونا تھا۔ ان سے صدر اسلامی مرکز نے خطاب کیا۔ اس کے بعد مس ماریہ خان اور مس راضیہ صدیقی نے بھی خطاب کیا۔ اس کے بعد سوال وجواب کا سیشن تھا۔ آخر میں تمام لوگوں کو قرآن کا جرمن ترجمہ اور جرمن زبان میں دعوتی لٹریچر دیئے گئے۔

• 5 جنوری 2019 کو امریکی طلبا کا ایک گروپ صدر اسلامی مرکز سے ملاقات کے لیے آیا۔ اس کا مقصد اسلام کی مثبت اور بے آمیز تعلیمات سے تعارف حاصل کرنا تھا۔ اس گروپ سے صدر اسلامی مرکز نے خطاب کیا اس کے بعد ماریہ خان اور راضیہ صدیقی نے بھی خطاب کیا۔ آخر میں سوال وجواب کا سیشن ہوا۔ طلبا نے کافی خوشی اور اطمینان کا اظہار کیا۔ ان کو قرآن کا انگلش ترجمہ اور دوسرے لٹریچر دیے گئے۔

• یکم جنوری 2019 سے 8 جنوری 2019 تک سہارنپور اور دہرادون سی پی ایس ٹیم نے مصر کی سیاحت کی۔ اس سیاحت کو سی پی ایس ٹیم نے دعوتی سیاحت میں تبدیل کیا، اور مختلف مقامات پر قرآن اور دعوتی لٹریچر تقسیم کیے گئے۔ مثلا جب یہ لوگ اہرام مصر کو دیکھنے گئے، اور ٹورسٹوں نے ان لوگوں کے ہاتھوں میں انگریزی ترجمہ قرآن دیکھا، تو سیاحوں نے ان سے مانگ کر ترجمہ قرآن حاصل کیا۔ اس کے بعد 6 جنوری 2019 کو یہ لوگ جامعہ ازہر دیکھنے گئے، تو وہاں کی لائبریری کو انھوں نے ترجمۂ قرآن اور صدر اسلامی مرکز کی دوسری کتابیں بطور تحفہ دیں۔

• سی پی ایس (دہلی) کی جانب سے ایک پروگرام ماسک اوپن ڈے (mosque open day) کے نام سے منعقد کیا جاتا ہے۔ اس کے تحت پارلیمنٹ اسٹریٹ کی مسجد میں 21 جنوری 2019 کو ایک انٹرایکشن رکھا گیا جس میں جواہر لال نہرو یونیورسٹی اور جامعہ ملیہ اسلامیہ (نئی دہلی) کے اسٹوڈنٹس نے شرکت کی۔ مسجد کے امام مولانا محب اللہ ندوی صاحب اور سی پی ایس ممبر مس ماریہ نے سامعین سے خطاب کیا۔ خطاب کے بعد سوال وجواب کا سیشن تھا۔ اس میں طلبہ نے کافی دلچسپی دکھائی اور انھوں نے کافی خوشی اور اطمینان کا اظہار کیا۔ آخر میں طلبہ کے درمیان انگریزی ترجمۂ قرآن اور دعوہ لٹریچر تقسیم کیا گیا۔

• مسٹرخرم قریشی صاحب (سی پی ایس، دہلی، موبائل نمبر9350212002 0091) ایر انڈیا کے کیپٹن پائلٹ ہیں۔ ان کی دعوت کا طریقہ یہ ہے کہ وہ جہاں بھی جاتے ہیں، وہاں مقامی لوگوں سے ملاقات کرتے ہیں، اور ان کو دعوت کے کام پر ابھارتے ہیں، یا دعوتی کام کرنے والوں کے ساتھ ملتے ہیں، اور دعوت کی پلاننگ کرتے ہیں۔ جنوری 2019 میں جب وہ ایر انڈیا کے ذریعے اسرائیل گئے، تو وہاں انھوں نے 21 جنوری 2019 کو یروشلم میں موجود سی پی ایس ٹیم کے ممبران سے ملاقات کی۔ ان سے ملنے کے بعد انھوں نے اپنا تاثر ان الفاظ میں لکھا ہے:

I met the team in Jerusalem. They are very hard working and passionate. They give a lot of time to dawah work. I shared a few ideas with them about which they were very excited. I will meet them again with more concrete plans.

• ساجد احمد خان (سی پی ایس، کامٹی- ناگپور) نے خبر دی ہے کہ ٹیم کے ایک ممبر نے Reliance Polyester کمپنی کے ایک ملازم مسٹر دلیپ کو ہندی قرآن کا ترجمہ جیون کا ادیشیہ اور ستیہ کی کھوج پیش کیا تو انہوں نے بڑے ادب کے ساتھ اسے قبول کیا اور کہا کہ میں انہیں ضرور پڑھوں گا۔ آپ لوگ بہت اچھا کام کر رہے ہو۔ لیکن یہ پوِتر کتابیں میں بغیر پیسہ دیے نہیں لے سکتا۔ ہمارے ساتھی نے اصرار کیا کہ سی پی ایس کی طرف سے یہ پیغام سبھی لوگوں کو بغیر کسی قیمت کے دیا جاتا ہے۔ اس کے باوجود مسٹر دلیپ نے انہیں 200 روپے دیے اور کہا کہ میں چاہتا ہوں کہ آپ اس پیسے سے مزید کتابیں تقسیم کریں۔

• مولانا وحید الدین خان صاحب کی تحریروں سے میرا روایتی شاکلہ ٹوٹا اور اسلام اور دین کو عصری اور سائنسی بنیادوں پر سمجھنے کی توفیق ملی۔ میں ماہنامہ الرسالہ کا 2006 سے قاری ہوں اور مولانا کی اکثر کتابیں پڑھ چکا ہوں۔ مثلاً مذہب اور جدید چیلنج، مذہب اور سائنس، فکر اسلامی، مسائل اجتہاد، اسلام دور جدید کا خالق، عقلیات اسلام، وغیرہ۔ اللہ انھیں عمر دراز عطا کرے۔ (محمد قاسم، بلوچستان)

• ہم لوگ مدرسہ میں تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ ہمیں مدرسے کے ایک استاد نے مشورہ دیا کہ ہم انڈیا کے ایک مفکر مولانا وحید الدین خاں صاحب کی کتب کا مطالعہ کیا کریں۔ چنانچہ ہم نے رازِ حیات کا مطالعہ کیا، اس سے ہم لوگوں کو بہت زیادہ motivation ملا۔ اسی طرح ہم لوگوں نے پایا کہ مولانا نے اسلام کو جدید سائنٹفک انداز میں پیش کیا ہے، جسے پڑھ کر ہمارا ذہن کھلا اور ہم کو روایت پرستی سے ہٹ کر دین کی صحیح کرن اور اس کی حقیقی تعلیمات سے آگاہی ہوئی۔ (محمد حمزہ عبد اللہ، محبوب الرحمن، عبد اللطیف، لقمان حکیم، جامعہ ستاریہ اسلامیہ، کراچی)

• My mother is a member of CPS international (Pakistan).On 15 January 2019 she received Al-Risala in Lahore, Pakistan. She was quite excited about it, but I, as a hobby reader, started reading the magazine unintentionally. I am writing this message to express my feelings and thoughts after reading the whole magazine. I belong to a Muslim family and my family background is

religious as well. Due to my parents' encouragement and also my willingness to receive higher education, I spent most of the time of my life in educational institutes. Right now I am an electrical engineer. I am part of a circle that is oriented towards technology, and sometimes I came across arguments from people of my religious community who would express a bad image about technology, and then I would see the same people drawing benefits from the technology they would speak badly about. So this scenario confused me: I thought do real teachings of Islam refrain us from becoming part of the ongoing advancements in technology. Also, I saw many of my colleagues and friends far from the teachings of Islam. Now, from various religious groups we often get pamphlets to spread among common people to teach them about Islam. But the content of these pamphlets is too tough and I myself get confused and question how the other person will understand the beauty of the Islamic message. When the other person is not a religious scholar or is not a frequent reader of Islamic studies, so how will he or she understand the content properly. Writing styles have changed during the past several years. Researchers have been trying to figure out appropriate size of a book, the length of a message and how much time a reader should spend on a specific topic. But many of our Islamic books were written years ago. Those books were the golden heritage for that period of time and for people of that age. The writers of these books wrote taking into consideration the scenarios of that time and the mentality of the people of their time. Today we face a problem when we force our young generation to study the same content that was written many years back to understand Islam. This has been my way of thinking, although I felt that I may be wrong since I have expertise in technology and not in Islamic studies. But today after reading Al-Risala, my thoughts have gained more clarity. Each and every topic, every page, every passage of Al-Risala has answered to my questions. Some of my questions were such that I did not have words to express the confusion of my mind. But this magazine not only gave me the right answers but also made my questions clearer. I started reading the first page, then second and I was not able to stop myself from continuing to read. I was so excited and happy. Whenever I find some answer to my vague thought, I would rush to my parents and repeat the line from the magazine that Maulana Sahab had written. One line that I would like to specifically mention here which I liked the most in the above context: "Islam ki talimat ko asri zehn kay liyay qabile fehm banana." Maulana sahab has precisely described each topic. I am really thankful to him. I request Maulana Sahab and everyone in this group to pray to Allah to show me the right path and give me the strength to make significant contribution in spreading Islam all around the world. (Syeda Amtul Gilani, Pakistan)

Date of Posting 10th and 11th of advance month
Published on the 1st of every month
Posted at NDPSO

Postal Regn. No. DL(S)-01/3130/2018-20
RNI 28822/76
Licenced to Post without Prepayment U (SE) 12/2019-20